ندیدی



حسن منظر

ندیدی

حسن منظر

۹ افسانے　　　　صفحات ۲۷۰

آگہی پبلیکیشنز حیدرآباد برلب۔ دریائے سندھ

جولائی ۱۹۸۲ء

"ندیدی"   مصنف: حسن منظر
آگہی پبلیکیشنز، حیدر آباد بر لبِ دریائے سندھ
طبع اول
جولائی ۱۹۸۲ء   تعداد ایک ہزار
کمپوزیٹر: شاہنواز شاہ شیرازی - مستری: اسرار احمد
اتحاد پرنٹنگ پریس، لطیف آباد ۷، حیدر آباد

قیمت: Rs.30.00

خط و کتابت کا پتہ: ڈاکٹر سید منظر حسن
۸ سی، بلاک اے - یونٹ نمبر ۱۰
لطیف آباد - حیدر آباد - پاکستان

حسن منظر
ندیدی

سرنامہ

بیچارے
صفحہ ۱

مخبر
صفحہ ۲۳

کھوکھلا شہر
صفحہ ۴۷

فائل نمبر ۷/جنگلات۔ جلد ۳
صفحہ ۷۹

رمسرنا
صفحہ ۱۱۹

للی
صفحہ ۱۴۷

ہوا بند کیوں ہے؟
صفحہ ۱۷۲

ندیدی
صفحہ ۱۸۵

ہمارے دن، ہمارا زمانہ
صفحہ ۲۱۲

اس کتاب کی تیاری میں مجھے ڈاکٹر طاہرہ منظر حسن
اور سید نوفل حسن کا تعاون ہمہ وقت حاصل رہا ہے

جناب محمد علی مالک اتحاد پرنٹنگ پریس نے میری مشکلات
کو سمجھا اور طباعت کے کام کو کچھ اس طرح
ترتیب دیا کہ میرے کلینک کے کام سے اسکا
تصادم بہت کم ہوا ،

سید کاظم رضا اور دیگر اراکین مجلس مصنفین، زبید احمد فردوسی،
رفیق شیخ، اور میرے ادیبوں کے بے نام کلب کے تمام ساتھی،
ع ۔ ق ۔ شیخ (آرٹسٹ) جنہوں نے سرورق تیار کیا،
خدابخش ابڑو (خطاط ۔ آرٹسٹ)، نور احمد (ٹائم فوٹوز)،
مراد علی مرزا، پیر عبدالحق جان سرہندی
اور اقبال پیرزادہ میرے کرم فرماؤں
میں سے ہیں اور ان سب کا
شکریہ ادا کرنا میں ضروری
سمجھتا ہوں۔

اپنے دو دوستوں

افکار (۱)

اور

صہبا لکھنوی (۲)

کیلئے

(ناموں کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی ہے مجھے دونوں یکساں عزیز ہیں)

---

(۱) ماہنامہ افکار۔ کراچی (۲) سید شرافت علی: مدیر، ادیب، شاعر

سرنامہ

مقدمہ بہادر شاہ، شاہ دہلی۔ ۱۸۵۸ء

گیارہویں دن کی کارروائی

سوال : کیا تم اپنا اخبار نکالا کرتے تھے اور وہ کس نام سے نکلا کرتا تھا؟

جواب: ہاں، میں ایک اخبار نکالتا تھا اور اُس کا نام اخبار دہلی تھا۔ مگر وہ اِس نام سے یا کسی اور نام سے مشہور نہ تھا۔

: ہاں، جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا جس کے مضامین قطعی انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے۔ اُس اخبار کا نام صادق الاخبار یا سچی خبریں تھا۔

سوال : کیا یہ پرچہ بڑا ہوتا تھا اور اُسکی اشاعت بہت تھی ؟

جواب: دہلی شہر میں اور باہر اُسکی دو سو کاپیاں نکلتی تھیں۔

سوال : دہلی جیسے بڑے شہر کے لئے دو سو اخبار بہت تھوڑے ہیں۔ کیا ہندوستانیوں میں یہ معمول ہے کہ اخبارات سننے کے لئے احباب ایک جگہہ اکھٹے ہو جاتے ہیں اور ایک اخبار کئی خاندانوں کے لئے کافی ہوتا ہے ؟

جواب: خریداروں کی یہ عادت ہے کہ اپنے اخبارات اپنے دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کے لئے دے دیتے ہیں۔

سرنامہ

مقدمہ بہادر شاہ، شاہ دہلی۔ ۱۸۵۸ء

گیارہویں دن کی کارروائی

سوال: کیا تم اپنا اخبار نکالا کرتے تھے اور وہ کس نام سے نکلا کرتا تھا؟

جواب: ہاں، میں ایک اخبار نکالتا تھا اور اُس کا نام اخبار دہلی تھا۔ مگر وہ اِس نام سے یا کسی اور نام سے مشہور نہ تھا—

: ہاں، جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا جس کے مضامین قطعی انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے۔ اُس اخبار کا نام صادق الاخبار یا سچی خبریں تھا۔

سوال: کیا یہ پرچہ بڑا ہوتا تھا اور اُسکی اشاعت بہت تھی؟

جواب: دہلی شہر میں اور باہر اُسکی دو سو کاپیاں نکلتی تھیں—

سوال: دہلی جیسے بڑے شہر کے لئے دو سو اخبار بہت تھوڑے ہیں۔ کیا ہندوستانیوں میں یہ معمول ہے کہ اخبارات سننے کے لئے احباب ایک جگہہ اکھٹے ہو جاتے ہیں اور ایک اخبار کئی خاندانوں کے لئے کافی ہوتا ہے؟

جواب: خریداروں کی یہ عادت ہے کہ اپنے اخبارات اپنے دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کے لئے دے دیتے ہیں۔

: ہاں (صادق الاخبار) دہلی میں بڑا اخبار سمجھا جاتا تھا۔

سوال : کیا بلوہ کے ایام میں قیدی نے کوئی عدالتی رسالہ نکال رکھا تھا؟

جواب: ہاں، ایک رسالہ نکلا کرتا تھا جو قلعہ کے اندر شاہی چھاپہ خانہ میں طبع ہوتا تھا۔ بلوہ سے پیشتر اُس میں خاص کر قلعہ کے متعلق خبریں ہوتی تھیں اور کبھی کبھی دیگر امورات پر بھی بحث ہوتی تھی۔ اس کا نام سراج الاخبار تھا۔

پندرہویں دن کی کارروائی

سوال : کیا بادشاہ بالعموم صادق الاخبار ملاحظہ کیا کرتے تھے؟

جواب: پڑھنے کی بابت تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ یہ اور دیگر اخبار اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔

: میں نے (صادق الاخبار) کبھی نہیں پڑھا۔

انگلستان میں روزنامہ مورننگ کرونیکل ۱۸۱۹ء میں چار ہزار اور جس دور میں چارلس ڈکنز اُس سے منسلک تھے چھ ہزار کی تعداد میں چھپتا تھا۔ دی ٹائمز کی روزانہ تعداد اشاعت ۱۸۵۴ء میں ۵۰,۰۰۰ تھی۔

”پریم چند گھر میں“ اور پریم چند کی آپ بیتی

”تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن (عوام کو راج کے خلاف فساد

کرنے پر اُکسانے والا مواد) بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔

—سوز وطن چھپنے کے بعد انگریز کلکٹر کے سامنے پیشی

میں نے ہنس جاری کیا۔ اس اسکیم کا مقصد پر سکون زندگی گذارنا، تھوڑا ادبی کام کرنا، اس اخبار کی ادارت اور سادہ لوح کسانوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونا ہے۔ لیکن ہنس کا استقبال اِتنی سرد مہری سے ہوا کہ عملی طور پر اِس پرچہ سے مجھے کچھ بھی نہیں مل رہا ہے۔

بک سیلروں سے روپے وصول نہ ہوتے تھے۔

جب اخباروں میں ایکٹریسوں کی تصویریں چھپیں اور اُن کے کمال کے قصیدے گائے جائیں تو کیوں نہ نوجوانوں پر اُس کا اثر ہو۔

میں کسی ایسے عظیم شخص کا تصور بھی نہیں کرسکتا جو موتی رولتا ہو۔ جب میں کسی ایسے شخص کو دیکھتا ہوں تو اُس کے آرٹ اور علم اور دانش کی میری نظر میں وقعت باقی نہیں رہتی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اُس نے خود کو موجودہ سماجی نظام کے سامنے سرنگوں کر دیا ہے جس میں دولت مند طبقہ قلم کی طاقت کو اپنی مقصد برآری کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ہندی میں بھی وہی کیفیت ہے جو اُردو میں۔ کتابیں نہیں بکتیں۔ پبلشر کوئی چھاپتے نہیں۔

گئودان کے لئے ایک پبلشر تلاش کر رہا ہوں۔ مگر اردو

میں تو جیسی ہے تم جانتے ہی ہو، بہت ہوا ایک روپیہ صفحہ کوئی دے دیگا۔

پاکستان میں جہاں سو میں سے پندرہ افراد پڑھے لکھے ہیں (۱۹۸۱ء) عوام تک اخباروں کی پہنچ کا حلقہ بڑا محدود ہے۔ انگریزی زبان کا اخبار -- تیس ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے۔ اُس کے حریف انگریزی اخبار کی تعداد گھٹتے گھٹتے چار ہزار رہ گئی تھی — اور اب وہ دوبارہ دس ہزار روزانہ چھپنے ہی پر مطمئن ہے۔ اس لحاظ سے جناب — مدیر صحافی، جن کا اردو کا اخبار --- روزانہ ۳۵,۰۰۰ کی تعداد میں چھپتا ہے ملک میں واقعی ایک طرح کی طاقت ہیں۔

V. S. Naipaul ودیادھر سورج پرساد نیپال

میری کہانی میری آپ بیتی ہے جسے میں نے دل کی بیماری سے اپنی پہلی شدید مڈبھیڑ کے زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا — پھر یہ بھی تھا کہ ہسپتال کے تمام بلوں کی ادائیگی کی طرف توجہ دینی ضروری تھی۔ میں نے ایک ایڈیٹر کو تار بھیجا — ایک ہی دن بعد وہ لکھنے کا تمام محنتانہ لئے آ پہنچا۔ وہ خطرہ مول لے رہا تھا کیونکہ اُس سمے میں بہت بیمار تھی اور اِس کا کم ہی امکان تھا کہ چند ابواب سے زیادہ لکھ پاؤنگی۔ اور وہ پھر بھی، وہاں، میرے مرجھائے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام کر اِس سودے پر راضی ہوگیا۔ اُس پل سے کتاب نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

(جب میں ہسپتال سے باہر کی دنیا میں آئی تو) کیرالا کے

بک اسٹالوں کو رسالے کے اُن شماروں کے سیلاب نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ۱۹۷۶ء

—کملا داس۔ ملیالم ناول نگار

"ملیالم کیا؟"

"کیرالا میں بولے جانے والی زبان۔ اُس علاقے کی جہاں شرح خواندگی کے ہندسے واقعی پڑھے لکھے افراد کی تعداد ظاہر کرتے ہیں اور یہ تعداد ایسی ہے کہ اُس سے متاثر ہوئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا"

"پھر بھی، ہے ایک علاقائی زبان"۔

وہ باتیں جو ابھی تک کسی مقدمے میں سننے میں نہیں آئی ہیں

سوال: تمہارے ملک کی آبادی کتنی ہے؟

جواب: سات کروڑ کے لگ بھگ— ہوسکتا ہے آٹھ کروڑ ہو (۱۹۸۲ء)

سوال: اتنے بڑے ملک میں کتابیں بھی بڑی تعداد میں چھپتی ہونگی؟

جواب: ہمارے یہاں کتابوں پر اُنکی تعداد اشاعت چھاپنے کا رواج ہے۔ اس سے ہم پہچان سکتے ہیں کہ یہ ہمارے یہاں کی چھپی ہوئی کتاب ہے۔ ویسے تعداد سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب کہاں اور کس زبان میں چھپی ہے۔ اگر پہلے یا دوسرے صفحے پر "پہلی بار"

"تعداد اشاعت ایک ہزار" یا "پانچسو" کے الفاظ پڑھنے میں آتے ہیں تو کتاب یقیناً اردو کی ہے اور اگر چھپنے کے دس سال بعد بھی بکسیلر وہی "پہلی بار، تعداد اشاعت ایک ہزار" یا "پانچسو" پرنٹ لائن والی کتاب آپکو فراہم کر سکتا ہے تو اس کے اردو کی کتاب ہونے میں میرا خیال ہے شبہہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہئیے۔

ویسے یہ بات میرے علم میں ہے کہ چند اور ملکوں میں بھی جہاں تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے کتابوں پر انکی تعداد اشاعت چھاپنے کا رواج ہے۔

کبھی کبھی یہ تعداد گیارہ سو، یا تین سو بھی ہوتی ہے۔ لیکن ایسا شاید تعداد اشاعت کی مونوٹنی (اکتا دینے والی یکسانیت) کو توڑنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ سیل پر اس سے فرق نہیں پڑتا۔

'جوتوں کی زبردست رعایتی سیل' کی طرح 'کتابوں کی رعایتی سیل' کے سرخ کپڑے پر چھپے ہوئے اشتہار بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی صرف پاپولر لٹریچر بکتا ہے۔

سوال: یہ حال صرف اُن ادیبوں کی کتابوں کا ہے جو مستند یا مقبول نہیں ہیں؟

جواب: نہیں، اردو کلاسیکی ادب کی ایک کتاب جو تقریباً ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور تاریخ سے تعلق رکھتی ہے ۱۹۷۹ء کے آس پاس ایک طویل عرصہ کے بعد پانچسو کی تعداد میں چھپی تھی اور چار سال بعد بھی بکنے کی منتظر

ہے۔ مستند، گذرے ہوئے اور موجودہ دور کے، اکثر ادیبوں کی کتابیں برسہا برس آؤٹ آف پرنٹ رہتی ہیں۔ کچھ کو قوم اس طرح خراج عقیدت پیش کرتی ہے کہ اُن کے ڈکیتی کے ایڈیشن نکلنے لگتے ہیں۔

سوال: اور ادبی رسالے؟

جواب: اصل میں ملک اتنا بڑا ہے کہ وہ کم ہی ایک علاقے سے دوسرے تک پہنچ پاتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو اپنے ہی شہر کے تمام علاقوں تک بھی نہیں پہنچ پاتے۔
ایک رسالہ، جس کے مدیر غزل گو شاعر ہیں اور جن کا ذریعۂ معاش بینک کی ملازمت ہے، پانچ سو کی تعداد میں چھپتا ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا اُس کے ڈسٹری بیوشن کی کیا صورت ہے؟ انہوں نے کہا ”دو سو اعزازی کاپیوں کی صورت میں نکل جاتا ہے، رہیں تین سو کاپیاں انکے پیسے کچھ مل جاتے ہیں کچھ نہیں ملتے“۔

سوال: تم نے کہا تھا کتابیں ایک ہزار یا پانچ سو یا تین سو کی تعداد میں چھپتی ہیں — بالعموم — کیا سات سو کے ہندسے کی طرف کسی ناشر کا خیال کبھی گیا ہے؟

جواب: تعجب ہے کبھی نہیں گیا۔

سوال: جہاں فلموں کی مہورت کی رسم سے اعتقاد کا ضعف ٹپکتا ہو اور ہندسوں کی اپنی occult مافوق الفطرت اہمیت ہو وہاں کیا سات سو کی طرف ناشر کا دھیان نہیں جانا چاہئیے تھا؟

جواب: ممکن ہے اب آپ کے اس سوال کے بعد جانے لگے۔

پانچ سو یا ہزار کے مقابلے میں سات سو کے ہندسے سے زیادہ امید رکھی جا سکتی ہے۔

سوال: کیا ہر کتاب کا صرف پہلا ایڈیشن ہی ہوتا ہے اور گیارہ سو کی تعداد آخری حد کا تعین کرتی ہے؟

جواب: بعض علاقائی زبانوں مثلاً سندھی کی کتابیں سنا ہے ۳۰۰۰ کی تعداد میں چھپتی ہیں اور انکی لگاتار مانگ رہتی ہے۔

پھر کچھ مخصوص پسندیدہ مضامین ہیں جن میں ادیب وہ مواد فراہم کرتا ہے جسکی پڑھنے والوں کو چاٹ ہوتی ہے، ضرورت نہیں۔ مثلاً ایک گھرانہ جس میں تمام پوانجی کو گھر میں موجود تپ دق کے ایک مریض کے علاج، اسکی خوراک، گھر کے دیگر افراد کے ایکس ریز اور خون کے معائنے پر صرف ہونا چاہیئے تھا کہ کوئی اور فرد۔ خانہ تو مرض کی لپیٹ میں نہیں آ چکا ہے — جیسے مریض کو بھول کر وہ گھرانہ رنگین ٹیلی وژن سیٹ یا بندوق خرید لیتا ہے۔ کیونکہ ضرورت اور چاٹ دو علیحدہ علیحدہ ذہنی مطالبے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ اور مضامین جنکی اہمیت سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کی طرح وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اُن پر لکھی جانے والی کتابیں اس ہزار یا گیارہ سو کی حد سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ ایک مخصوص دور میں بار بار اور ہر بار بڑی تعداد میں چھپتی ہیں اور کچھ افراد یا ادارے انھیں بار بار خریدتے ہیں۔

بہت کچھ مصنف پر بھی منحصر ہے۔ اگر وہ کم آمیز

نہیں ہے اور دھندے کا گر جانتا ہے تو ادب کی بساط پر وزیر یا کوئین کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، سیدھا ترچھا، جتنے گھر چاہے بیک وقت چل سکتا ہے۔ لیکن ایسا کرتے کرتے ایک دن وہ یہ غلطی کر بیٹھتا ہے کہ لوگوں کے مسائل کو حل کرانے کے لئے ڈھائی گھر چل کر دکھانے کی کوشش بھی کرتا ہے اور وقت جو اُس کا مقابل ہوتا ہے اُس پر بساط الٹ دیتا ہے۔ اُس کے ہاتھی دانت، onyx یا سفید اور سبز قیمتی پتھروں سے ساخت کئے ہوئے مہرے جن کے پیندوں میں مخمل لگی ہوتی ہے زمین پر بکھر جاتے ہیں۔ اِن مہروں کو اُس نے کن کن جتنوں سے حاصل کیا ہوتا ہے، کبھی دوسروں کو خرید کے کبھی خود اپنے آپ کو بیچ کر۔ اُنہیں اُن کے قیمتی خوبصورت اندر سے ساٹن لگے ہوئے ڈبے کو کھول کر اپنے معزز ملنے والوں کو — جن میں صاحبِ اقتدار بھی ہوتے ہیں اور صاحب ثروت بھی — وہ سالہا سال سے دکھانے کا عادی رہا ہوتا ہے۔ پھر جن مہروں — اور الکے خوبصورت قیمتی ڈبے — کی تعریف کھیل کو نہ سمجھنے والے اُس کے ہر معزز شناسا نے بارہا کی ہوتی ہے جیسے کسی آن دیکھی جھاڑو کی لپیٹ میں آ کر ایکدم نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔

اور وقت دوسری میز پر اگلی move (چال) دینے کے لئے چلا جاتا ہے۔

سوال: کیا یہ درست ہے اِس خطۂ ارض کے کہانی لکھنے والوں کا محبوب شغل مثلث بنانا رہا ہے؟

جواب: جی ہاں، ایک لیٹی ہوئی لائن اور اُس کے اوپر، ایک دوسرے سے بیزار، دو کھڑی ہوئی لائنیں — جن کے سر بدقسمتی سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔

سوال: کیا اِسی طرح مصنف۔ تصنیف، ناشر۔ ڈسٹری بیوٹر اور ناقد۔ قاری کا کوئی مثلث بنتا ہے؟

جواب: بنتا تو ہے لیکن تھوڑا سیڑھا سا، کیونکہ لائنیں سدا اِدھر اُدھر گر پڑنے کو تیار رہتی ہیں اور تین میں سے کبھی دو اور کبھی محض ایک لائن رہجاتی ہے۔

سوال: وہ کیسے؟

جواب: مصنف بسا اوقات خود ناشر ہوتا ہے، یا اگر اُسکی مناسب 'پہنچ' نہیں ہے اور اُس میں 'پاور' کا فقدان ہے تو آدھی عمر یعنی اپنا سب سے زیادہ ذہنی اُپج کا زمانہ ناشر کی تلاش میں گنوا دیتا ہے۔ 'پہنچ' اور 'پاور' یعنی دبدبہ، ہماری ثقافت (ایک مروجہ اصطلاح) میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ ثقافت چاہے overvalued تصور ہو — جسکی قیمت زیادہ لگا دی گئی ہے— لیکن پہنچ اور پاور یقیناً اوورویلیوڈ نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ ناشر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور ناشر مل جانے کے بعد ایک عجیب و غریب کھیل شروع ہو جاتا ہے — رسی پر چل کر دکھانے کا کرتب جو اُسے تاعمر جاری رکھنا پڑتا ہے۔

رسی کبھی ٹائٹ کر دی جاتی ہے، کبھی اوور ٹائٹ اور کبھی ڈھیلی۔ وہ رسی پر ڈگمگاتا رہتا ہے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ خوف زدہ نہیں ہے وہیں سے لوگوں

کے سر پر کبھی کبھی چھڑی بھی مار بیٹھتا ہے۔

اُسکی اِس حرکت پر کچھ لوگ کھلکھلا اٹھتے ہیں۔ وجہہ کم ہی سمجھ پاتے ہیں کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ رسی پر بیلینس قائم رکھنے کا عمل ہوتا ہے اور مختلف رنگوں کی چھڑیاں بدل بدل کر اگر انجام دیا جائے تو بہت دیر تک چل سکتا ہے۔ اس حقیقت سے صرف مصنف آگاہ ہوتا ہے کہ یہ بھرم قائم رکھنے کا عمل ہے۔

اگر عام آدمی اُکتا کر وہاں سے آگے بڑھ جاتا ہے تو بجائے ملول ہونے کے مصنف اِسے اپنی فتح سمجھتا ہے۔ جب تک اُس میں اور عام آدمی میں ذہنی فاصلہ برقرار ہے وہ مخصوص افراد کے لئے اپنا ایکٹ جاری رکھ سکتا ہے۔ یہی اُسکی معراج ہے۔ یوں بھی عام آدمی میں دلچسپی وہ بہت پہلے کھو چکا ہوتا ہے۔

سوال: ایسے میں اُس کی تصنیف کا کیا بنتا ہے؟ کیسے وہ لوگوں تک پہنچتی ہے؟

جواب: جب تک وہ رسی پر ہے اُسے اِس بارے میں نہیں سوچنا پڑتا۔

ایسے ادیبوں میں سے اکثر کو تو یہ بھی نہیں سوچنا پڑتا ہے کہ لکھنے سے چھپنے کے درمیان کچھ صعوبتوں سے پُر منزلیں بھی پڑتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا جائزہ لینے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں اور مراعات یافتہ طبقے سے آنے والے تقریباً تمام افراد کی طرح تہذیب سے تہی بھی۔

انہی رسی پر چلنے والوں میں سے بہت سے وہ ہوتے ہیں جو ایک بار رسی پر پہنچ جانے کے بعد اپنی یادداشت کھو بیٹھتے ہیں — کہ وہ وہاں کیسے پہنچے تھے، ایسا کرنے کے لئے انہوں نے کیا ذرائع استعمال کئے تھے۔ یادداشت کا کھو بیٹھنا اُنکے حق میں ہوتا ہے ورنہ سیدھے سچے انسانوں کی عظمت کے نغمے لکھنا اُنکے لئے دشوار ہوجائے اور یہ اندرونی تضاد انہیں جینے نہ دے۔

کتابوں کی نکاس کا گلہ، بک سیلروں سے روپے وصول نہ ہونے کا دکھڑا، اگلی کتاب کے لئے پبلشر کی تلاش، اپنے پرچے کا سردمہری سے استقبال ہونے پر کڑھنا، اور کتابوں کے نہ بکنے کا رونا — یہ سب اُن کے بکھوڑے ہیں جو رسی پر نہیں چڑھنا چاہتے ہیں۔

ان میں سے کچھ محض لکھنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور چھپوانے کی حرص کو نہیں جانتے۔ یہ شاید یہاں کی مٹی کا اثر ہے کہ اُنکی تخلیقی صلاحیت بھی بہت جلد اور بہت سی جائز خواہشات کی طرح قناعت میں بدل جاتی ہے۔ اپنی تحریر کے نہ چھپ سکنے کی بددلی کو ادیب خود کو 'ستائش کی تمنا سے بے نیاز' ٹھہرا کر ہی اپنے میں ختم کر سکتا ہے۔

کچھ اس امید میں — بالخصوص چھوٹے شہروں کے رہنے والے — دیوان کے دیوان مرتب کر جاتے ہیں کہ شاید اُن کے بیٹے پوتے ان میں دلچسپی لے سکیں اور چھپوائیں، یا خاندان کے شجرے کی طرح انہیں محفوظ رکھیں۔ لیکن آبادیوں کی لگاتار گردش میں پھنس کر بہت سے خاندان

یہ ورثہ میں آنے والی ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں بھی گنوا بیٹھے ہیں۔

جو کسی نہ کسی طرح کتاب چھپوانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اُنہیں ہر رسالے اور اخبار کو تبصرے کے لئے دو جلدیں بھیجنی پڑتی ہیں۔

سوال: اُن پانچ سو یا ہزار جلدوں میں سے؟

جواب: جی ہاں، انہی پانچ سو یا ہزار جلدوں میں سے — کیونکہ اِس سے زیادہ جلدیں بھیجنے کا مطالبہ کوئی اخبار یا رسالہ نہیں کرتا ہے۔ جہاں جہاں کتابوں پر تبصرہ چھپتا ہے یہی الفاظ پڑھنے میں آتے ہیں "تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے"

سوال: ایک ہی جلد سے کام کیوں نہیں چل سکتا ہے؟

جواب: ایک رسم سی ہے۔ تبصرہ نگار اور اخبار یا رسالے کے مدیر، ہر دو کے مطالعے کے لئے ایک ایک جلد ہوتی ہے۔

سوال: کیا ایسے ملک میں جہاں ایک اخبار کئی خاندانوں کے لئے کافی ہوتا ہے ایک ہی جلد کو رسالے سے متعلق افراد باری باری سے نہیں پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: یہ تو رسم کو توڑنے کی بات ہوگی اور رسمیں بڑی سخت جان ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ کتاب پر اخبار یا رسالے میں تبصرہ ہو نہ ہو مصنف کو اتنا اطمینان تو رہتا ہے کہ اسکی تحریر اسی بہانے عوام تک نہ سہی چند پڑھنے کا صحیح ذوق رکھنے والوں کے ہاتھ میں پہنچ جائیگی

(ش)

اور اُسے کتابوں کے انبار کو اک عمر اپنے ساتھ رکھ کر نہ بالآخر ردی کے مول بیچنا ہوگا نہ ایسے کتب فروشوں کے حوالے کرنا پڑے گا جو کتاب اور گوٹا پیمک کا فرق نہیں جانتے۔ جو کتاب کو کتاب اُس وقت سمجھتے ہیں جب وہ اُنہیں سلما ستاروں سے جڑی اور لچکے سے آراستہ نظر آئے۔ یہی معیار اکثر کتاب خریدنے والوں کا بھی ہوتا ہے۔

ایسے بک سیلر ادیب کو ہمیشہ یہی درس دیتے رہتے ہیں کہ کونسا 'مال چالو' ہے اور کونسا نہیں اور جو کسی کنفیکشنر (سموسے، کیک اور اسی قماش کی چیزیں بیچنے والے) کی طرح مصنف یا ادبی رسالے کے مدیر سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ چاہے تو 'مال' اُن کے پاس چھوڑ جائے اور نہ بکنے کی صورت میں اُسے خود آکر اُٹھا لیجائے۔

بڑے بڑے بک سیلروں کی اپنی علیحدہ دنیا ہے۔ باہر کے ملکوں کی کتابیں جنہیں بغیر پیشگی قیمت ادا کئے وہ نہیں حاصل کرسکتے تھے انہیں 'نکالنا'، عوام کے بگڑے ہوئے ٹیسٹ کا خیال رکھنا اور اُن میں اُسی ٹیسٹ کی پرورش کرنا، بڑے بڑے اداروں سے پیچیدہ لین دین۔ وہ تو اُلجھنوں سے بھری ہوئی کاروبار کی دنیا ہے جسے نہ غیر کاروباری ادیب سمجھ سکتا ہے نہ جس سے وہ نمٹ سکتا ہے۔

ویسے آج بھی بک سیلروں کی دنیا میں خال خال وہ افراد پائے جاتے ہیں جو پاور اور پہنچ نہ رکھنے والے ادیب اور صحیح ادبی ذوق رکھنے والے قاری کے تعلق کو

کسی طور برقرار رکھے ہوئے ہیں اور معاملے کے کھرے ہیں۔ اُن میں بھی تعلیم پھیلانے کی لگن ہوتی ہے اور خود ادبی ذوق رکھتے ہیں۔

'مال' کے اٹھا لینے کی نوبت کم ہی آتی ہے یہاں مصنف بےوجہہ وقتاً فوقتاً اپنے بکسیلروں کو خط لکھتا رہتا ہے۔ کچھ ادبی رسالے جنہیں عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لئے قلیل سرمایے سے چند جرائت مند نوجوان بڑی امیدوں کے ساتھ نکالتے ہیں ماہ دو ماہ کی بک اسٹالوں پر جبراً فری سپلائی کے بعد بند ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے میں نے کہا تھا اگر ''تبصرے کے لئے چار جلدوں کا آنا ضروری ہے'' کی عبارت ہی اخبار یا رسالے کے اُس کالم یا صفحے پر چھپنے لگے تو بھی مصنف کو ایک طرح کی ڈھارس رہے گی کہ اُس کی کتابیں پڑھی جا رہی ہیں۔ تبصرہ کئے جانے کی ضمانت کا نہ اُس کالم میں ذکر ہوتا ہے نہ ہی مصنف اُسکی توقع رکھتا ہے۔

یوں بھی تبصرہ ہمارے یہاں ہمیشہ سے، زیادہ تر، ذاتی پسند نا پسند کا معاملہ رہا ہے۔

سوال: تبصرہ نہ ہونے کی صورت میں کتابیں مصنف کو واپس کر دی جاتی ہیں؟

جواب: ہمارے یہاں کے ہر ادارے میں خواہ وہ سرکاری ہو خواہ نیم یا غیر سرکاری کسی چیز کے ملنے کی نہ رسید بھیجنے کا رواج ہے نہ کسی قسم کے مراسلے کے جواب دینے کا۔

(ض)

سوال: تو کیا تبصرے کے لئے چند جلدیں بھجوانے کے بعد مصنف کی ساری کتابیں اُسی کے پاس دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

جواب: نہیں، ہماری تہذیب کا یہ جزو بھی ہے کہ مصنف سے ہر با اثر شخص توقع رکھتا ہے کہ وہ اُسے اپنی تصنیف بطور تحفہ یا خراجِ عقیدت پیش کرے۔ کبھی کبھی خراج عقیدت نہ ملنے پر خفگی کا اظہار بھی اشاروں کنایوں میں کر دیا جاتا ہے۔

سوال: کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ با اثر شخصیتیں ایسی سوغات لینے کی رسم کو اُس وقت کیلئے اٹھا رکھیں جب یہاں بھی ہر ادبی کتاب اور ادبی رسالہ کم سے کم پچاس ہزار ہی کی تعداد میں چھپنے لگتا ہے؟ حالانکہ آبادی کے تناسب سے وہ بھی کم ہوگا۔

جواب: اس کے لئے ہمیں غالباً پچاس ہزار ایسے خاندان بھی پیدا کرنے پڑینگے جن میں کم سے کم ایک شخص علم و ادب سے واقعی دلچسپی رکھتا ہو۔ جو شاید ابھی کئی نسلوں تک ممکن نہ ہو۔ اس لئے با اثر اشخاص کا مصنف سے یہ توقع رکھنا بے جا نہیں ہے کہ وہ اُنہیں اپنی تصنیف بطور خراج عقیدت پیش کرے۔

"But that is ridiculous and suicidal."

"ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارا مزاج شاہانہ ہے۔ مراعات یافتہ حاکمِ ادب اور حاکمِ وقت دونوں ہی ایک لہجے میں بات کرتے ہیں۔ مزاج کے اعتبار سے حالی، حسرت موہانی

اور پریم چند کو freaks (عجوبے) کہا جا سکتا ہے۔ کچھ اُن جیسے مزاج والے ابھی بھی دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن بہت کم۔ ہم بنیادی طور پر زود رنج ہیں۔

با اثر ادارے بھی، با اقتدار لوگوں، موتی رولنے والوں اور مستند عالموں کی طرح باہر کے ملکوں سے آنے والی کتابیں اور رسالے خریدتے ہیں اور اردو کے ادبی رسالوں اور تخلیقی ادب کی کتابوں کی اعزازی کاپیوں کے متمنی رہتے ہیں۔

ویسے کچھ علاقائی زبانوں سے یہ رواج اٹھتا جا رہا ہے۔ اسے وہ ادب کی اور اس کے ساتھ ساتھ خود اپنی موت سمجھنے لگے ہیں۔ اُن زبانوں کے مستند ادیب اور عام قاری ہر نئی ادبی کتاب خریدنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

سوال: اور اردو میں اعزازی کاپیوں اور تبصرے کے لئے جانے والی جلدوں کے بعد بچی ہوئی کتابوں کا بالآخر کیا حشر ہوتا ہے؟

جواب: میرا خیال ہے اس کے لئے آپ کو ایک اور سوال کرنا پڑے گا۔

"کیا؟"

"ادیب کس کے لئے لکھتا ہے؟"

"پڑھنے والوں کے لئے۔ عوام کے لئے"

"That's a delusion— ایک ایسا پختہ غلط خیال یا عقیدہ جو ہم اپنے دماغوں میں لئے پھرتے ہیں۔ وہ بیشتر اپنے وقار، اپنی شہرت— اور self-aggrandizement کبھی کبھی اپنی دولت — کو بڑھانے کے لئے لکھتا ہے۔ یا پھر غیر شعوری طور پر اپنے اور پڑھنے والے کے درمیان آنے والوں کے دھندے کو چمکانے کے لئے جو پچاس اور ساٹھ فیصد 'پر مال اٹھاتے ہیں' — لکھنے والا وہ دیہاتی ہے جو مویشی پالتا ہے، جس کے پلنگ پر چڑھ کر بکریاں پیشاب کرتی ہیں، جس کا لڑکا اُس کے ڈھوروں کو دھوپ میں لئے لئے پھرتا ہے اور بنسری نہیں بجاتا۔ پھر جب وہ شہر کے بازار میں اُن ڈھوروں کو لے جاتا ہے تو وہ اُس سے اونے پونے خرید لئے جاتے ہیں اور اس کے ہاتھ سے نکل کر چند گھنٹوں میں وہیں کھڑے کھڑے انکی قیمت کئی بار بڑھتی ہے — کیونکہ بازاری نظام میں اسی طرح ہوتا ہے"۔

سوال: ڈھور بیچنے والا کچھ تو لے کر گھر لوٹتا ہے۔ ایک عام لکھنے والے کو کیا ملتا ہے؟ یعنی اردو کے اُس ادیب کو جو دھندے کے گروں کو استعمال نہیں کرنا چاہتا ہے۔

جواب: وہ پھکٹ میں رہتا ہے۔ اس کے لئے یہی کیا کم ہوگا کہ اسکی تحریر بک اسٹال تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے۔

(ع)

اگر وہاں باہر سے آنے والی کتابوں کے آس پاس اُسکی کتاب کو جگہہ مل جاتی ہے تو اس سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے کہ وہاں سے کہاں جاتی ہے۔ عوام سے اسکا ناتہ تو ٹوٹ ہی چکا ہے۔ یا یہ کہ توڑا جا چکا ہے۔

"جب تم اخبار نویس تھے تو تم کو ہر بات کی خبر رکھنی چاہیئے تھی"۔

مقدمہ بہادر شاہ، شاہ دہلی۔ ۱۸۵۸ء
(انگریزی فوجی کمیشن کی کارروائی)

حسن منظر

حیدرآباد برلبِ دریائے سندھ
۳۰ جون ۱۹۸۲ء

بیچارے

رات کو جس وقت میرے ہوائی جہاز نے لندن ائر پورٹ کے رن وے کو چھوا باہر بارش میں ملی ہوئی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن چونکہ مجھے جلد ہی کیتھی کا چہرہ اُن لوگوں میں نظر آ گیا تھا جو اپنے رشتے داروں کو لینے یا ان سے ملنے ائرپورٹ پر آئے ہوئے تھے اس لئے مجھے اپنے فلیٹ تک پہنچنے کے بارے میں زیادہ سوچنا نہیں پڑا۔

بوٹ میں سامان رکھنے کے بعد میں کیتھی کے برابر کی سیٹ پر ڈھیر ہو گیا اور اپنی سفید فورڈ کو جب وہ ٹریفک کے ہجوم سے نکال کر نسبتاً خاموش سڑک پر لے آئی تو میں نے سگار سلگاتے ہوئے کہا:

”تھوڑا سا شیشے کو نیچے رکھنا ڈرائیور کے لئے اچھا ہوتا ہے، ورنہ اس گرم چھوٹی سی آرامگاہ میں تم ڈرائیونگ وھیل پر ہاتھ دھرے دھرے ہی سو سکتی ہو۔“

اُس نے بغیر میری طرف دیکھے کہا

"You may keep smoking"

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دوبارہ اُس وقت چونکا جب کیتھی سگار کو میرے منھ سے نکال رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا "تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں سو گیا تھا؟"

اس نے کہا "تمہارے خراٹوں سے"

میرا فلیٹ آگیا تھا۔ شکریہ ادا کرتے ہوئے باقی باتیں اگلی صبح کرنے کا میں نے وعدہ کیا۔ سیاہ پتھر جڑی ہوئی سڑک پر کھڑے کھڑے میں نے اُسے "بائی" کہا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ ملگجی روشنی میں بند دروازوں کے باہر دودھ کی خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اور سوائے ایک فلیٹ کے سب میں اندھیرا تھا۔ کھڑکیوں کے پیچھے اوپر سے نیچے کو کھینچ کر بند کئے ہوئے پردے نظر آ رہے تھے۔

وہی پرانا ماحول — یعنی میں اپنے گھر واپس پہنچ چکا تھا۔ کیتھی میں یہ بڑی خوبی ہے وہ ضروری سوالات بھی صرف اُس وقت کرتی ہے جب میں انہیں سننے کے موڈ میں ہوتا ہوں۔

اگلی صبح میں نے اپنی ڈاک کا جائزہ لیا، بلوں کا اور اکاؤنٹس کا۔

صفائی کرنے والی عورت آئی اور اُس نے کام کرتے ہوئے پوچھا "مسٹر حسن سفر کیسا رہا؟"

"ٹھیک رہا" میں نے بینسن اینڈ ہیجیز کا سرخ چپٹا ڈبہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اُس نے تھینک یو کہہ کر ایک سگریٹ نکالا اور اپنے ایپرن کی جیب میں اسے رکھتی ہوئی بولی

"اتنے مہنگے سگریٹ کو میں ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ کام ختم کر کے"

میں نے پورا ڈبہ اسکے حوالے کرتے ہوئے کہا "کم آن۔ اولڈ گرل۔ پہلے ایک سگریٹ میرے ساتھ پیو۔ پھر کام کرنا"

"سو یو فیلٹ ایٹ ہوم ڈئیر مسٹر حسن؟" اُسنے منھ سے دھوئیں کا پہلا غبارہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

میں اُسے بتانے لگا اگر وہاں سے اسکی مراد پاکستان ہندوستان تھے تو یہ اسکی غلط فہمی تھی۔ وہاں بسنے والے رشتہ داروں کے نام تک سے میں ناواقف تھا۔ اور اگر اس کا اشارہ کسی اور ملک کی طرف تھا تو ان سے چند ماہ پہلے تک میری واقفیت بھی اتنی ہی تھی جتنی ایک عام لندن میں بسنے والے کی ہوتی ہے۔

مجھے معلوم نہیں صفائی کرنے والی عورت کس وقت باہر گئی اور کب کیتھی مجھ سے میرے سفر نامے کے نوٹس لینے آئی جنہیں اسے ترتیب دینا تھا اور ٹائپ کرکے مجھے دینا تھا تاکہ میں اپنی کتاب پر کام شروع کر سکوں۔

لیکن کتاب پر کام شروع کرنے سے پہلے میں وہ چھوٹے چھوٹے تمام کام کر لینا چاہتا تھا جو راہ میں حائل ہو رہے تھے اور جنہیں ہر سیاح کی طرح میں اپنے ذمے لگا لایا تھا۔

مثلاً کمبوڈیا میں اینگکورواٹ کے کھنڈرات یا وشنو کی یاد میں بنائے ہوئے اُس مہا مندر میں جس بوڑھے سے میری بھینٹ ہوئی تھی اُس نے کھانستے ہوئے تذکرتاً کہا تھا 'سنا ہے پھیپھڑوں کی نالیوں کے دمے کے لئے کوئی نئی دوا انگلینڈ میں ایجاد ہوئی ہے؟'

میں ۵۰۰ ایکڑ پر پھیلے ہوئے اس مندر کی بالکنیوں اور روشوں پر گھوم گھوم کر اس وقت تک تھک چکا تھا اور بوڑھے کے

نزدیک زمین پر بیٹھ کر میں نے اپنے گرمی سے تپے ہوئے پاؤں کو جوتوں سے آزاد کر کے ٹھنڈے فرش پر رکھ رکھا تھا۔
بوڑھے نے بہت احتیاط سے میرے مووی اور اسٹل فوٹوگرافی کے کیمروں کو اپنی گود میں رکھ لیا تھا تاکہ ان پر مٹی نہ لگ جائے اور میں اُس خاموش ماحول میں بیٹھا نوٹس لکھ رہا تھا۔
آسمان بادلوں سے لدا ہوا تھا اور بوڑھے کا سانس پھول رہا تھا۔ اُس نے جیسے اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا "سنا ہے وہ دوا مرض کو ختم کردیتی ہے۔"

میں نے اینگکورواٹ سے متعلق نوٹس کے درمیان بریکٹوں میں بوڑھے کا نام اور پتہ درج کیا اور یہ سوچ کر من ہی من میں مسکرایا کہ ہمیشہ کی طرح کیتھی یہ لائینیں علحدہ کاغذ پر ٹائپ کر کے مجھے دیگی اور کہے گی:
"شاید ان صاحب کا تعلق موجودہ صدی سے ہے اور ان کا نام اور پتہ کتاب میں شامل کرنا ہمارے لئے دشوار ہوگا۔"
میں نے بوڑھے سے ہمدردانہ لہجے میں کہا کہ میں جا کر اپنے فزیشن دوستوں سے جو لندن کے تقریباً ہر ہسپتال میں ہیں معلوم کرونگا کیا کوئی ایسی دوا ایجاد ہوئی ہے اور اگر ہوئی ہے تو اس کی سال چھ ماہ کی سپلائی اسے کسی جرنلسٹ دوست کے ساتھ یقیناً بھیجونگا۔
میرا خیال تھا یہ پیشکش سن کر بوڑھے کا چہرہ جگمگا اٹھے گا اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ مشرق ہر اُس چیز کے مغرب میں دریافت یا ایجاد ہونے کا منتظر رہتا ہے۔
لیکن اُس نے بغیر کسی تاثر کو چہرے پر لائے کہا "خط کا انتظار کرنے میں کیا ہرج ہے"۔

پھر وہ دونوں کیمروں کو مجھے تھما کر اپنے کام میں لگ گیا۔ اُسے میرا خط ملنے کی اتنی ہی آشا تھی جتنی اس رات نیند آنے کی اور میرا خیال ہے شاید دوا کے نہ ملنے پر اُسے اتنا ہی صدمہ ہوتا جتنا زندگی کا سمے ختم ہوجانے پر۔
اینگکورواٹ یعنی اُس صدیوں پرانے مندر میں جو درحقیقت ایک طرح کا شہر ہے رہتے رہتے آسرا اور وقت اس کے لئے بے معنی الفاظ بن چکے تھے۔

اسی طرح سیلون میں ایک بدھ مٹھ کے بھکشو سے میں نے ایک کتاب کا تذکرہ کیا تھا جو حال ہی میں لندن اور نیویارک سے شائع ہوئی تھی اور جس میں بدھ مت کی دنیا کی تمام یادگار عمارتوں، مورتیوں اور اسٹوپاز کی رنگین تصویریں تھیں۔
یہ مٹھ کولمبو سے باہر کچھ ہی فاصلے پر تھا اور اس کے چاروں طرف کنگ کوکونٹ کے پیڑ تھے۔ یہاں میں دوسری بار آیا تھا۔ پہلی بار اس وقت جب کینڈی اور انورادھا پورہ جا رہا تھا اور دوبارہ اس دن جب لنکا سے ہندوستان میری روانگی تھی۔ درمیان کے وقفے میں میں نے انورادھا پورہ کے خرابے کو دیکھا تھا اور سنہالی دور کے اینٹوں سے بنائے ہوئے مٹھوں کی تصویریں لی تھیں جو بدھا کی یاد میں بنائے گئے تھے۔

اسی طرح کینڈی کا بدھا کے دانت کا مندر میرے ذہن میں تھا اسکا ایک ایک پتھر، ایک ایک شہتیر اور ان پر کیا ہوا کام۔ بدھا کا دانت جس کمرے میں تھا مجھے سخت افسوس تھا اُسے میرے لئے نہیں کھولا جاسکتا تھا اور اس طرح میں یہ تصدیق نہیں کرسکتا تھا کہ وہاں واقعی کوئی دانت ہے یا محض اعتقاد کو کسی مخمل لگے ہوئے صندل کے ڈبے میں لوگوں نے لوگوں کے لئے رکھ رکھا ہے۔

اُس کمرے کے باہر کی بالکنی کی چھت میں جو ہاتھی کی تصویر بنی ہوئی ہے میں اس کے نیچے سے یونہی ایک نظر ڈالتا ہوا گذر جاتا اگر ایک پجاری نے مجھ سے رک کر اس تصویر کو دوبارہ دیکھنے کے لئے نہ کہا ہوتا۔ اس کے کہنے پر میں نے دوبارہ اس ہاتھی کو بے دلی سے دیکھا کہ شاید گنیش کا سائیڈ ویؤ ہے لیکن ٹھٹک کر رہ گیا اور پجاری ہلکی سی ہنسی ہنسا جو وہ ہمیشہ سے ہنستا آیا ہوگا۔

وہاں چترکار نے پوجا کے لئے آنے والی لڑکیوں کو اس طرح پیش کیا تھا کہ ان کے آپس میں مل جانے سے ہاتھی کی تصویر بنگئی تھی۔

میں نے پجاری سے بنانے والے کا نام پوچھا لیکن اُس نے میرے سوال کو غیر اہم سمجھا اور مجھے ایک بیٹھے ہوئے بدھا کے سامنے رکھے ہوئے سفید پھولوں کے بارے میں بتانے لگا۔

یہی سوال میں نے دوبارہ ملاقات پر کولمبو میں اپنے بھکشو دوست سے کیا تھا۔ بیچ کے وقفے نے جو میں لنکا کے مختلف شہروں میں گذارکر آیا تھا اس میں اور مجھ میں ایک طرح کی اپنائیت پیدا کردی تھی جو اس کے چہرے پر بھی ہویدا تھی لیکن جسے تسلیم کرنے سے وہ انکاری تھا کیونکہ اپنائیت ہی سے موہ جنم لیتا ہے اور موہ کو ختم کرنے ہی کے لئے شاید اُس نے دنیا چھوڑکر زعفرانی رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے مجھ سے برما اور بھارت کے بارے میں بہت سے سوالات کر ڈالے۔ پھر اُس کے پیش کئے ہوئے ناریل کا پانی پی کر میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اس سے وہ کتاب بھیجنے کا وعدہ کر کے آیا تھا اور فوٹیلز

کو فون کرکے میں نے اس کتاب کے بارے میں پوچھا۔ کتاب ان کے پاس موجود تھی اور اسکی قیمت ۲ پاؤنڈ تھی۔ فوئیلز والوں کو کتاب سیلون بھیجنے کا آرڈر دے کر میں نے کام کی لسٹ سے بھکشو اور اُس مونا سڑی کا نام کاٹ دیا۔

مجھے اپنے اندر یکسوئی آتی ہوئی محسوس ہوئی جسکی مجھے اس وقت سخت ضرورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد مینچیسٹر سے فائق علی کا فون آیا۔ وہ مجھسے اپنے رشتے داروں کے بارے میں پوچھنا چاھتا تھا جن سے میں کراچی میں ملا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مشرق کے سفر پر جانے سے پہلے میں نے اس سے فون کرکے پوچھا تھا وہ جو تمہارے سیکنڈ ڈگری کزنس وہاں آباد ہیں ان کا پتہ تمہیں معلوم ہے؟ اور اس وقت انکے بارے میں کہ کیسے لوگ ہیں، مجھ سے کس طرح پیش آئے وہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ جیسے ناعمہ اور اس کے گھر والے اس کے نہیں میرے رشتے دار تھے۔

میں نے اس سے پتہ اس لئے حاصل کیا تھا کہ کسی گھر کو میں اندر سے دیکھ سکوں، کس طرح وہاں لوگ رہ رہے تھے، انکی کیا مشکلات تھیں اور کیا آرزوئیں۔ ورنہ ہوٹلوں میں ٹھہر کر اور گائیڈز یا گائیڈ بکس سے کسی ملک کے بارے میں جو معلومات فراہم کی جاتی ھیں انکا وہاں کی حقیقی زندگی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا ہے۔

کولمبو سے کراچی پہنچنے کی اگلی صبح میں نے مغربی پاکستان کے مختلف شہروں کے ہوٹلوں میں اپنی بکنگ کی تصدیق کی تھی، کچھ اپنے پروگرام سے متعلق ٹیلی فون کئے تھے اور اس کے بعد ایک یوروپئن ڈرگ مینوفیکچرنگ کمپنی کو فون کیا تھا جہاں ناعمہ کام کرتی تھی۔

میرا خیال تھا اسے وہاں سب جانتے ہونگے لیکن مجھے بتایا گیا وہ پیکنگ گرل تھی اور صرف لنچ کے وقفے میں اُس سے بات کی جاسکتی تھی۔
میں ابھی بات کر ہی رہا تھا کہ ریسیپشنسٹ نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کردیا۔
ناچار مجھے فرم کے جنرل مینیجر کو فون کرنا پڑا۔
فون کے دوسرے سرے پر جو شخص بیٹھا تھا شروع میں تو سخت برہم تھا کہ میں خود ناعمہ کے گھر جا کر کیوں نہیں وہ ضروری بات کرسکتا تھا جو مجھے کرنی تھی اور کیوں اس کا وقت ضائع کیا گیا تھا لیکن جب میں نے بتایا کہ میں ایک انگریزی کا ادیب یہاں کے دورے پر ہوں اور اس شہر سے قطعاً ناواقف، تو اس نے بڑے مہذب لہجے میں مجھ سے میرا فون نمبر پوچھتے ہوئے انٹرکام پر کسی سے اردو میں کہا:
”دیکھو ناعمہ نام کی کوئی لڑکی پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتی ہے۔ اس سے کہو میرے کمرے میں آکر جو فون نمبر میں دونگا اس پر فون کرے“۔
پھر اس نے مجھ سے نہایت خلیق لہجے میں تھوڑی دیر انتظار کرنے کیلئے کہا۔
اس اثناء میں، میں اس کمرے میں پاکستانی موسیقی کی ہلکی ہلکی آواز سن سکتا تھا اور دو آدمیوں کے کسی مقامی زبان میں بات کرنے کی جو اردو نہیں تھی۔
تھوڑی دیر بعد جب میں نے ٹیلی فون اٹھایا تو دوسری طرف سے کسی کے سہمے ہوئے لہجے میں بات کرنے کی آواز آئی۔
یہ ناعمہ تھی جو میرا خیال ہے مجھ سے، ایک قطعی غیر مود

سے اپنے بوس کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے لجا رہی تھی اور ساتھ ہی میں ڈر رہی تھی کہ اسکی آواز سے اُس کمرے کے وقار کو ٹھیس نہ لگ جائے۔

آواز سے میں نے اندازہ کیا اسکی عمر ۲۰ کے آس پاس ہوگی۔ اس نے مجھ سے آہستگی سے پوچھا ”جی آپکو مجھ سے کیا کام ہے؟“ اس کے بعد گفتگو مکمل طور سے یک طرفہ رہی اور اگر وہ آہستہ آہستہ ”جی، جی، جی ہاں“ نہ کہتی رہتی تو میرے لئے یہ جاننا مشکل ہو جاتا کہ ٹیلی فون بیچ میں سے کٹ تو نہیں گیا ہے، کیونکہ موسیقی کی آواز بھی بند ہو چکی تھی اور نہ ہی کمرے میں کوئی اور بول رہا تھا۔

اس سے بات کرتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا ٹیلی فون کے دوسرے سرے پر کوئی بہت خوبصورت لڑکی کھڑی ہے جسے کمرے میں موجود باقی آدمی ہوس بھری نظروں سے گھور رہے ہیں اور اسی وجہ سے اُسکا بس نہیں چل رہا کہ وہ انکی نظروں سے بچنے کیلئے ٹیلی فون کے ریسیور میں گھس جائے۔ اسکی ”جی، جی ہاں“ بھی مجھے بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اُسے بتایا کہ میں اسکے کزن فائق کا دوست ہوں اور انگلینڈ سے یہاں چند دن کے لئے آیا ہوا ہوں۔ پھر میں نے خود ہی کہا میں اُن لوگوں کے گھر آنا چاھتا ہوں اور اگر وہ پتہ بتا سکے تو ٹیکسلا وغیرہ سے واپسی پر انکے گھر خود ہی کسی شام پہنچ جاؤنگا۔

اس نے سرگوشی میں کہا ”آپ دن اور اپنا پتہ بتا دیجئے، میرے بھائی آپ کو لینے آجائینگے۔“

یہ دوسرا اور آخری جملہ تھا جو اُسنے کہا تھا۔

میں نے ڈائری کے ورق الٹتے ہوئے اس دن کو تلاش کیا جب مجھے کراچی سے بیروت رات کو روانہ ہونا تھا اور اسکے بھائی کو مجھے لینے آنے کے لئے وقت دے دیا۔

فائق سے میں نے ٹیلی فون پر ان لوگوں سے ملنے کا ذکر کیا لیکن سوائے اسکے کہ اگر وہ مشرقی بیوی چاہتا ہے تو ناعمہ سے بہتر لڑکی اُسے سوئیز کے پورب میں کمبوڈیہ تک نہیں مل سکتی ہے اور کوئی بات اسکے لئے دلچسپی کا باعث ثابت نہیں ہوئی۔

ہوا یوں تھا کہ مقررہ تاریخ اور دن پر ہوٹل کے ریسپشنسٹ نے میرے پاس ایک چیچک رو نوجوان کو بھیجا تھا جو اپنی بہن ہی کی طرح ڈرا ہوا سا تھا اور مجھے اپنے گھر لیجانے آیا تھا۔
میں نے اس سے کچھ پینے کیلئے کہا لیکن اس نے بڑے تپاک سے کہا

"وہاں گھر میں چائے پر آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے"۔
میرا خیال ہے مجھ سے زیادہ وہ اس ہوٹل سے خائف تھا جس میں شاید وہ پہلی بار آیا تھا اور اس کے کپڑے اُس ہوٹل کی دنیا سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔
میں نے ٹیکسی کے لئے ویٹر سے کہا اور اس کے ساتھ ٹہلتا ہوا باہر سڑک پر نکل آیا۔
؛ راستے بھر اُسے مزید خفیف ہونے سے بچانے کیلئے میں خاموش رہا اور وہ ٹیکسی والے کو گھر کا راستہ بتاتا رہا۔
ہم شہر کے مختلف علاقوں سے گذرے جنکی تہذیب جدا جدا تھی۔ سڑکوں پر پھرنے والوں کی اکثریت کے کپڑوں، چہروں اور جسموں سے پتہ چلتا جاتا تھا کہ ہم تمول اور افراط سے غربت اور ضرورتمندی

کی طرف درجہ بدرجہ اترتے جا رہے تھے اور جہاں ناعمہ رہتی تھی وہاں کی عورتیں برقع پہنتی تھیں۔ کچھ بچوں کی ناکیں بہہ رہی تھیں اور کچھ ننگے پیر تھے۔ بعض جگہوں پر سڑک کے کنارے پلنگ بچھائے لوگ اُن پر بیٹھے یا لیٹے تھے۔
اس علاقے میں غیر ملکی لوگ بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

ناعمہ کا بھائی مجھے ایک پھیکے پیلے رنگ کی عمارت میں لیکر داخل ہوا اور نیم تاریک زینوں سے ہوتے ہوئے شاید تیسری منزل کے ایک فلیٹ میں ہم داخل ہوئے۔
مجھے کچھ دیر تک ایک کمرے میں تنہا بیٹھے رہنا پڑا جس کے لئے میں ذہنی طور سے تیار ہوکر آیا تھا۔ مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ پاکستان آتے ہی مجھے ان لوگوں سے مل لینا چاہیئے تھا اور آج ملک چھوڑتے وقت اگر دوبارہ ملنے آتا تو ہم اس اثناء میں آپس میں اتنے بے تکلف ہو چکے ہوتے کہ میں صحیح طور سے ان کے خیالات اور انکی امنگوں کا اندازہ لگا سکتا۔
عجیب بات ھے پہلی ملاقات خواہ طویل ہی کیوں نہ ہو وہ آشنائیت پیدا نہیں کرسکتی ھے جو وہ وقفہ پیدا کر دیتا ہے جو دو مختصر ملاقاتوں کے درمیان آجاتا ہے۔

کمرے میں سب سے پہلے داخل ہونے والی ناعمہ کی ماں تھی: میرے اندازے کے مطابق ادھیڑ عمر کی، گیہواں رنگت اور اچھے نقوش والی۔ اس کے بعد ناعمہ کی بڑی بہن آئی تھی جو عمر کے لحاظ سے اپنی ماں کی چھوٹی بہن لگتی تھی۔ لیکن وہ ایسی تھی کہ اسکا ذکر چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔ سب سے آخیر میں ناعمہ کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر میں دنگ

رہ گیا تھا۔

بجائے ایک گھنٹہ گذارنے کے ان لوگوں کے ساتھ میں نے وہ پوری شام گذار دی۔ اور جب وہاں سے اٹھا تو ان کے پورے خاندان اور پچھلی زندگی سے واقف ہو چکا تھا۔

میری تواضع گھر میں تلی ہوئی چیزوں سے کی گئی تھی اور ناعمہ کی بڑی بہن نے ماں اور ناعمہ کے اصرار پر مجھے میرا بائی کا ایک بھجن سنایا تھا۔

ناعمہ نے ماں کے کہنے پر میرے لئے اٹھکر کونے میں رکھے ہوئے گراموفون پر ایک چٹخا ہوا رکارڈ لگایا تھا جسے میں نے مصنوعی توجہہ سے سنا تھا۔

کمرے میں لگی ہوئی تصویروں سے بھی میں متعارف ہو چکا تھا۔ ان میں سے ایک ناعمہ کے باپ کی تھی۔ غالباً اورتھوکرومیٹک orthochromatic کاغذ پر اودے یا تانبے کی سی رنگت میں لی ہوئی ۱۹۳۰ اور ۴۰ کے درمیان کی تصویر۔

باقی گھر والوں کی طرح اُس تصویر کو میں نے بھی بڑے احترام سے ہاتھ میں لیکر دیکھا اور اُسے دوبارہ دیوار پر ٹانگ دیا گیا۔

میں نے ناعمہ اور اسکی ماں کو خط لکھنے کا وعدہ کیا جو مجھے افسوس تھا انگریزی میں ہوگا کیونکہ اردو رسم الخط سے میں ناواقف ہوں۔ یوں بھی میری اردو پر وہ لوگ ہنستے رہے تھے۔ میں نے فائق کی ماں سے خط لکھوانے کا بھی وعدہ کیا لیکن جب میں وہاں سے اٹھا تو میری طبیعت اندر سے خوش نہیں تھی۔ ہر چیز کو جو دیکھنے کے لائق نہیں تھی میری نظروں سے چھپا دیا گیا تھا حتیٰ کہ بالکنی کی وہ الگنی جس پر کمرے میں

میں نے داخل ہوتے وقت کپڑے ٹنگے دیکھے تھے جب میں ناعمہ کی ماں کے آنے پر اٹھ کر کھڑا ہوا تو مجھے کپڑوں سے خالی نظر آئی تھی۔ جیسے کسی نے چپکے چپکے جا کر اور اکڑوں بیٹھ کر اُن کپڑوں کو تار پر سے کھینچ لیا ہو۔

فائق سے فون پر بات ہوجانے کے بعد میں نے اپنی لسٹ پر سے ایک اور اندراج پر بال پائنٹ پھیر دیا۔

تصویریں پرنٹ ہونے کے لئے جا چکی تھیں اور مجھے امید تھی اگلے دو چار دن میں میں آسند کو بھی اسکے کنبے کے افراد کی تصویریں اور بے بی سوٹ بھیجدونگا جسکا میں انسے وعدہ کرکے آیا تھا۔

آسند سے میری ملاقات مغربی پاکستان کی ایک جھیل پر ہوئی تھی جہاں وہ کشتی بان تھا اور اُس نے اپنے پورے علاقے کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں کہ پہلے یہ جھیل پہاڑیوں کے بیچ کی جگہہ تھی، پھر اُس میں دریا کا پانی چھوڑ دیا گیا تھا اور دور جوٹاپو نظر آ رہا تھا اصل میں ایک عورت کا مزار تھا جہاں لوگ پہلے پیدل چل کر جاتے تھے اور اب چونکہ ہر شخص وہاں تک کرائے پر کشتی کرکے نہیں جا سکتا تھا اس لئے اکثر کنارے ہی پر سے منت مان لیتے ہیں۔

آسند کے گھر والوں نے مجھے سرخ رنگ کی روٹی کھلائی تھی جو چاول کے آٹے کی تھی اور اسکے ساتھ کے لئے اس نے ایک اور کشتی بان سے مانگ کر میرے لئے ایک بڑی سی مچھلی تلی تھی۔
میں آسند سے نہ صرف اسکے بچوں کی رنگین تصویریں بھیجنے کا وعدہ کرکے آیا تھا بلکہ ایک ایسا بے بی سوٹ بھی جس میں سر

سے لیکر پاؤں تک بچے کو زپ لگا کر بند کر دیا جاتا ہے۔ صرف منھ کھلا رہتا ہے اور پھر اس جھیل سے ہوکر آنے والی ٹھنڈی ہوا سے اُس کے بچے کو جو ماں کے پیٹ میں آخری دو، تین مہینے گذار رہا تھا نمونیا ہونے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر رہ جائیگا۔

آسند کے اکثر بچوں کو کئی بار برونکو نمونیا ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے انکی بیماری کی تفصیل سن کر لگایا تھا۔ وہ لوگ اُسے کسی قسم کا اثر سمجھتے تھے۔ دو ایک بچے اسکی نذر بھی ہو چکے تھے۔

اس قسم کا سوٹ اور وہ بھی ان پہنا اس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اُس نے جو معلومات مجھے بہم پہنچائی تھیں اور اس کے کنبے نے جیسا سواگت میرا کیا تھا یہ بے بی سوٹ ایک طرح سے اسکے لئے ممنونیت کا اظہار تھا۔

آہستہ آہستہ، اُس لسٹ میں اور کمی آتی گئی۔

آسند کا نام بھی کٹ گیا اور ہندوستان کی اُس کیتھولک ٹیچر بڑھیا کا بھی جس سے میں نے سلسلہ میں سینٹ فرانسس ژیوئیر Saint Francis Xavier کی پہلی آرامگاہ دیکھنے کا ذکر کیا تھا۔ اُس چوکور گڑھے کا جہاں سے مرحوم کی لاش کو بعد میں گوا لیجا کر دفن کیا گیا تھا۔

بڑھیا نے مجھ سے بڑی عقیدت سے کہا تھا "میں آپ کے لئے جو کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوں، وہ تصویر آپ مجھے بھیج سکتے ہیں ؟"

میں نے تصویر بھیجنے کا وعدہ کر لیا تھا

بڑھیا کا نام لسٹ سے کاٹ کر جب میں نے اپنا جائزہ لیا تو مجھے لندن آئے تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے اور اپنی نئی کتاب پر کام بھی میں کب کا شروع کر چکا تھا۔

زندگی اُسی طرح چل رہی تھی جس طرح مشرق کے سفر پر جانے سے پہلے تھی۔ اخبار، لکھنے کا کام، دوسرے کام، پڑھنا، لائبریری، شام کو ٹہل کر آکے ٹی۔وی۔ دیکھنا اور نیند۔

ایک دن کیتھی نے اُس چھوٹے سے پیلے پیکٹ کو جو تقریباً ہفتہ بھر سے میری لکھنے پڑھنے کی میز پر پڑا تھا اٹھایا اور پوچھا

"اسے پوسٹ نہیں کرنا ہے؟"

میں اس وقت دوسرے کمرے میں تھا اور وہیں سے میں نے پوچھا

"کسے؟"

"یہ مس ناعمہ سو اینڈ سو۔ کراچی۔ کے نام والا پیکٹ"

میں اپنی اسٹڈی میں لوٹ آیا اور کیتھی سے بولا "تمہیں معلوم ہے اس میں کیا ہے؟"

"دو سو فیٹ اسکاچ میگنیٹک ٹیپ۔ پولی ایسٹر کا"

"بس یا اور کچھ؟" میں نے کیتھی سے پوچھا۔

"ٹیپ، کارڈ بورڈ بوکس میں بند ہے، اس کے چاروں طرف سلائیم پیڈنگ ہے اور اُسے تم نے ھاؤس میڈ (گھر کا کام کرنے والی) سے کپڑے میں سلواکر اس پیلے لفافے میں بند کیا ہے"۔

"لیکن ٹیپ میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیتھی نے پیکٹ کو میز پر رکھتے ہوئے کہا "تمہاری آواز اُس لڑکی کے لئے"

"نہیں" میں نے کہا "کاش اتنا آسان ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو

میں اسے کب کا یا تو خود پوسٹ کر چکا ہوتا یا تمہیں پوسٹ کرنے کیلئے دے دیتا“

”تمہارے دوست فائیک کی آواز“ کیتھی نے دوبارہ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا ”یا اسکی ماں کی، اس گیہوں کی رنگت والی خوبصورت ادھیڑ عمر عورت کے لئے“

پھر اس نے مسخرے پن سے پوچھا ”آگے چل کر کسی ناول میں مرکزی کردار اس لڑکی کا ہوگا یا اسکی ماں کا؟“

میں پھر بھی چپ رہا

اُس نے کہا ”میں جانتی ہوں بڑے ہونے کے عمل میں تم ماں کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکے ہو اور لڑکی کی جگہہ — —“

میرے چہرے پر کوئی تاثر آتے نہ دیکھ کر اُس نے پرکھنے والے لہجے میں کہا ”ہٹے! کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”کیتھی میں ہفتہ بھر سے اس پیکٹ کو روز سپرد ڈاک کرنے کے بارے میں سوچتا ہوں اور پھر کام میں لگ جاتا ہوں کیونکہ اس ٹیپ میں جو آواز ہے تم سوچ بھی نہیں سکتیں کس کی ہوگی“

”کس کی؟“ کیتھی نے پوچھا۔

اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے کہا ”میں ہفتہ بھر سے سوچ رہا ہوں اسے ناعمہ کو بھیجنا مناسب رہے گا یا نہیں۔ سوچ سوچ کر بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں جب اس کو فراہم کرنے اور پیک کرانے میں اتنا اہتمام میں نے کیا ہے تو اب پوسٹ آفس جا کر تلوانے اور اس پر اسٹامپس لگانے میں کیا ہچکچاہٹ ہے۔ لیکن پھر فوراً ہی خیال آتا ہے اس کے بعد جب اس پر مہر لگ چکے گی اور وہ جو کہتے ہیں ڈاک کے سپرد کردینا تو یہ

پیکٹ جب میرے ہاتھ سے نکل جائیگا اور پھر مجھے خیال آئیگا کہ میں نے غلطی کی ہے تو میں اُسے آگے جانے سے کیسے روک سکونگا۔ اس حقیقت کا ادراک جیسے مجھے پہلی بار ہو رہا ہے کہ کوئی چیز جسے کسی کے سپرد کر دیا جائے اپنی نہیں رہتی"

اس نے کہا "مثلاً؟"

"مثلاً ہوا کے سپرد کیا ہوا تیرہ زمین کے سپرد کیا ہوا ٹھنڈا بدن اور — —"

اس نے کہا "یہ رہا تمہارے اندر چھپا ہوا مشرقی آدمی"

میں نے کہا "کیتھی میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ اس ۳×۳ پیکٹ کا کیا کیا جائے۔ ادھر آتے جاتے اس کے پیلے رنگ کے مضبوط لفافے پر ایک آدھ بار میں نے بے وجہہ انگلی بھی پھیر کر دیکھا ہے کہ اس پر دھول جمع ہو گئی ہے یا نہیں اور خود ہی اپنی اس حرکت پر ہنس پڑا ہوں یہاں دھول کا کیا گذر ہے اور نہ اس ٹھنڈے ملک میں دھول پیدا ہوتی ہے۔ شاید ایسا کرتے وقت میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیکھوں میرے لکھنے کی میز پر پڑے پڑے اسے کتنا عرصہ ہو چکا ہے۔ مشرق میں چیزوں کے ایک ہی جگہہ پڑے رہنے کو اسی طرح جانچا جاتا ہے کہ انہوں نے کتنی دھول اور مٹی اپنے اوپر جمع کرلی ہے"۔

کیتھی نے سنجیدگی سے کہا "مجھے پینسل اور نوٹ بک لے آنے دو — میرا خیال ہے یہ اسی کتاب کا حصہ ہے جس پر تم آج کل کام کر رہے ہو"۔

میں نے کہا "ممکن ہے میں خود اسے ناعمہ کو بھیجنے کا اب اتنا متمنی نہیں رہا ہوں۔ کتاب میرے دن کا بیشتر حصہ اپنے صرفے میں لے لیتی ہے اور اس پر کام کرتے ہوئے میں اس پیکٹ، ناعمہ

اور اس کے زندہ اور مردہ خاندان کو مکمل طور سے بھولا ہوا ہوتا ہوں۔ ایک مصروف ادیب کو جو اپنی کتاب کے لئیے مواد جمع کرتا پھرتا ہے یوں بھی وہ افراد جلد ہی بھول جاتے ہیں جنسے اس نے اس اور اُس شہر میں دن، دو دن کے لئے تعلق پیدا کیا ہوتا ہے، انکی تصویریں لی ہوتی ہیں اور گھر پہنچ کر تصویر بھیجنے کا وعدہ کیا ہوتا ہے جو کم ہی وفا ہوتا ہے۔

بالآخر وہ شخصیتیں کردار بنکر رہجاتی ہیں اور وہ جگہیں انسانی زندگی کے عالمی ڈرامے کے بہت سے اسٹیج، جن پر بیک وقت کتنے ہی ناٹک کھیلے جا رہے ہیں، یا کھیلے جا چکے ہیں''

''کیتھی نے تیزی سے نوٹس لیتے ہوئے کہا ''پیش لفظ کے لئیے میں اسے کام میں لے آؤنگی''

پھر میں نے ٹھیر کر کہا ''ممکن ہے ناعمہ اور اس کے گھر والے بھی ابتک افراد کی جگہہ میرے ذہن میں کردار بن چکے ہیں اور یہ پیکٹ اس وقت کی یادگار ہے جب میں بحرالکاہل سے لیکر بحیرہ عرب تک کے اپنے سفر سے تازہ تازہ گھر پہنچا تھا اور میری ڈائری میں لکھا ہوا تھا کس کے لئیے کیا کرنا ہے، کسے کیا بھیجنا ہے۔

تمہیں یاد ہے میں نے بتایا تھا کس طرح ناعمہ کا بھائی مجھے میری فرمائش پر اپنے گھر لیجانے آیا تھا؟''

کیتھی نے نوٹ بک اور پینسل کو میز پر رکھتے ہوئے 'ہاں' کہا۔ ''مجھے ایک بار وہ سین پھر دھرانے دو۔ پھر تم فیصلہ کرنا اس پیکٹ کو ان لوگوں کو بھیجنا مناسب رہیگا یا نہیں۔

اس کمرے میں ہر چیز سے ایک عجیب خواہش کا اظہار ہو رہا تھا۔ خود کو منوانے کا۔ اور اسی لئے ہر وہ چیز وہاں سے ہٹا دی

گئی تھی جو اُن لوگوں کو اپنے معیار سے پست نظر آ رہی تھی۔ ناعمہ کا بھائی جو سینے کی کسی بیماری کا مریض ہے مجھے اس سے زیادہ نہیں بتا سکا کہ وہ ریلوے میں ہے۔ لیکن کیا؟

ناعمہ خود کو پیکنگ گرل بتاتے ہوئے جھجھک رہی تھی اور اسکی ماں نے کئی بار کہا 'آپکو نہیں معلوم ان کے باپ کیا تھے اور اپنے بچوں کے لئے وہ کیا کرنا چاہتے تھے'

میں نے پوچھا تھا 'وہ کیا تھے؟' اور ناعمہ کی ماں نے کہا تھا 'فنکار' اور ناعمہ پوستھیومس posthumous بچی تھی۔

اس پر مجھے وہ تصویر دیوار سے اتار کر دکھائی گئی تھی اورتھوکروسیٹک پلیٹ پر لی ہوئی کسی نوجوان کی تصویر جسکی عمر میرا خیال ہے ناعمہ کی ماں کو بیوہ چھوڑ کر جاتے وقت ۳۰ سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی اور اب وہ خود ۴۴،۴۵ سے زیادہ نہیں تھیں۔

میں ہر چیز کو بیدلی سے دیکھ رہا تھا اور شروع میں اُس خوبصورت بیوہ سے ملتے وقت جو خوشی مجھے ہوئی تھی وہ اس رنجدہ ماحول میں کھوتی جا رہی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا ناعمہ کے باپ کا فن زیادہ تر انکی بڑی بیٹی میں آیا ہے کیونکہ وہ باپ کی گود میں بیٹھی تھی اور بہت اچھا گاتی ہے۔ ناعمہ کو شروع ہی سے نوکری کے لئے تیار کیا گیا تھا لیکن اسکی بڑی بہن گلوکارہ تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میرے مووی کیمرے کو دیکھ کر انہیں خیال آیا ہو کہ میں ان لڑکیوں کو فلموں کے لئے سائن کر سکتا ہوں۔

اُس لڑکی کے فن کی بار بار تعریف سنکر مجھے بھی اسکا گانا سننے کی فرمایئش کرنی پڑی۔ جیسی مجھے توقع تھی پہلے اُس نے کافی دیر تک انکار کیا اور مجھ سے کہیں زیادہ اپنی ماں اور ناعمہ کے اصرار پر بالآخر اس نے کچھ گانا شروع کیا جو مجھے بتایا گیا میرا کا بھجن ہے۔

اب مجھے ان لوگوں پر ترس آنے لگا تھا کیونکہ لڑکی یا اس عورت کی آواز اوپر جانے میں ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔

پھر مجھ سے اُن رکارڈوں کی تعریف کی گئی جن میں سے کچھ ناعمہ کے باپ کے جمع کردہ تھے اور کچھ کو بعد میں ماں نے جمع کیا تھا۔

ماں کے کہنے سے رکارڈ مجھے ایک ایک کرکے دکھائے گئے اور انہیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا ۴۵ اور ۳۳⅓ آر۔ پی۔ ایم۔ کے رکارڈوں کا دور ابھی یہاں تک نہیں پہنچا ہے کیونکہ رکارڈ وہی بھاری اور موٹی ۷۸ آر۔ پی۔ ایم۔ کی ڈسکس تھیں جنہیں گراموفون میں سوئی لگا کر سنا جاتا ہے۔ ان کے جیمنی ٹوئنز Gemini Twins والے پیلے لیبل،ہاتھی کی سونڈ اور گھوڑے اور شیر کے لیبل میرے لئے بالکل نئے تھے اور میں چاہتا تھا ایسی چند ڈسکس صدر سے (جو شہر کا سینٹر ہے) خرید کر ساتھ لیجاؤں۔ وہاں میں نے انہیں پرانی کتابوں کے ساتھ بکتے دیکھا تھا۔ انکے grooves گروز گھس چکے تھے اور بعض بالکل سپاٹ تھے۔

ناعمہ کا بھائی ایک طرف کو خاموش بیٹھا تھا اور کھڑکی کے باہر اندھیرا ہو چلا تھا۔

ایک رکارڈ خاص طور سے ناعمہ کی ماں نے میرے ہاتھ میں دیا اور کہا "یہ ہیں انکے باپ"

میں نے دیکھا اس پر ہلکے نیلے رنگ کا لیبل لگا ہوا تھا جس پر دو چیتل بنے تھے۔ رکارڈ پر کیلکٹا رکارڈنگ کمپنی اور موسیقی آر۔ سی۔ بی۔ اور آرکیسٹرا کنڈکٹر کا نام پی۔ کے۔ درج تھا۔ باقی تحریر ہندی میں تھی۔ رکارڈ میں بال پڑ گیا تھا اور اسکے کنارے کو خوش اسلوبی سے پیتل کی باریک کیلوں اور پتی سے جوڑا گیا تھا تاکہ مزید نہ ٹوٹ سکے۔

میں نے رکارڈ سننے کی فرمایش کی اور اُسے فوراً ہی پورا کردیا گیا۔ آواز میری سنی ہوئی تھی اور میرے خیال میں یہ گانا میں ہندوستانی vintage (کہنہ) موسیقی جمع کرنے والوں کے گھر میں برطانیہ میں کہیں سن چکا تھا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ کہاں کہ ایک دم ناعمہ کی ماں نے کہا ”اب وہ آنے والے ہیں“

اسکے فوراً ہی بعد بانسری کی ایک تان تھی۔

ناعمہ نے اور اسکی بہن نے رکارڈ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بیک وقت کہا

”یہ رہے وہ“ "there he is"

رکارڈ اسی طرح کٹ کٹ کرکے بجتا رہا۔ ایک بار سوئی کے ایک ہی گروو groove میں پھنس جانے پر ناعمہ نے بھاری playing head پلیئنگ ہیڈ کو اٹھا کر آہستہ سے آگے رکھ دیا۔

میں ان لوگوں کے چہروں کو دیکھنے سے کترا رہا تھا۔ کئی بار وہ intermezzo یا بانسری کا ٹکڑا آیا جس پر وہ لوگ زیادہ متوجہہ ہوجاتے تھے۔ میں نے سوچا اگر یہ رکارڈ ٹوٹ جائے تو ان کے پاس کیا رہ جائیگا۔

ھوٹل واپس لوٹتے ہوئے میں نے سوچا میرے لئے ہوئے تمام نوٹس کتنے ادھورے تھے: اُن میں زیادہ سے زیادہ یہ لکھا تھا اینگکور اور انورادھا پورہ اور کینڈی کے مندر کن کن راجاؤں نے بنوائے تھے۔ دہلی اور آگرہ کی بعد کی عمارتوں کے بارے میں کچھ زیادہ کہا جا سکتا تھا کہ کس نے انہیں ڈزائین کیا تھا، انجینئیروں کے نام۔ لیکن کسی پتھر کے بارے میں، میں کہہ سکتا تھا اُسے وہاں اٹھا کر کس نے رکھا تھا اور وہ پتھر پر قالین جیسا کام کن ہاتھوں نے کیا تھا،،۔

کیتھی نے کہا ”میں فیصلہ کر سکتی ہوں۔ تم اس دو سو فیٹ اسکاچ ٹیپ کو یہیں پڑا رہنے دو۔ مجھے معلوم ہے اس میں کیا ہے جو تم اس خاندان کو دینا چاہتے ہو۔ لیکن اُسے سننے کیلئے ان کے پاس ٹیپ رکارڈر ہوگا؟،،

”میں انہیں ایک بھیج سکتا ہوں،، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”اور اس سے انہیں احساس ہوگا کہ تم یہ ٹائٹر لے کر وہاں سے آئے ہو کہ اُس انٹرسزو کے سوا ان کے پاس کچھ اور نہیں ہے۔ انکی غربت کا احساس۔ کہ وہ ایک چیز سے چپکے ہوئے ہیں،،

اس نے پیکٹ کو میز پر سے اٹھا کر دیکھا اور دوبارہ وہیں رکھ دیا۔

”اسے یہیں رکھے رہو۔ لکھتے وقت اسکے سامنے ہونے سے تمہارے افراد کردار نہیں بنینگے،،

کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے کہا ”Care for a walk?،، (گھومنے کا ارادہ ہے؟)

اس نے کہا ”بالکل۔ میرے گھر تک؟،،

مخبر

دُبلے پتلے تقریباً ۵ فٹ کے لڑکے نے کتابوں کی دوکان میں داخل ہوتے ہوئے نہ دوسرے گاہکوں پر نظر ڈالی نہ ہی دوکاندار پر۔ وہ پہلی ہی شیلف کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا اور کتابوں کو دیکھنے لگا۔ اُس کا سانس پھول رہا تھا جیسے اُس میں محنت کا کام کرنے پر سب کا پھولنے لگتا ہے۔

دوکاندار کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ بھی موسم کی اسی کیفیت کا شکار نظر آتا تھا۔

لڑکا دوکان کے باہر کھڑی ہوئی سائیکل پر گاہے گاہے نظر ڈال لیتا تھا اور دوکاندار اس پر۔ دونوں کو کھٹکا تھا — ایک کو سائیکل کی چوری کا، دوسرے کو کتاب کی۔

گاہک آتے اور جاتے رہے۔ ان کی ذہنی افتاد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ سب سے پہلے کس شیلف کا رخ اختیار کرتے تھے۔ تاریخی کتابوں والی کا یا اس کا جس پر انقلاب اور سیاسی اور معاشی مسائل پر لکھی جانے والی نئی اور کلاسیک مطبوعات سجی ہوئی تھیں۔ کچھ عام فکشن کے دلدادہ تھے اور کچھ جرائیم پیشہ نہ سہی، جرائیم کے پجاری ضرور تھے۔ بعض محض مذہبی لٹریچر میں دلچسپی رکھتے تھے اور آنے والے انقلاب سے متعلق کتابوں پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے اپنی خرید کو احترام سے سنبھالے دوکان سے باہر نکل جاتے تھے۔

لیکن دبلا پتلا لڑکا اس شیلف کے سامنے کھڑا تھا جس پر جنس اور نفسیات سے متعلق کتابیں سجی ہوئی تھیں کیونکہ وہی جگہہ سب سے خالی تھی اور دوکان میں عورتوں اور بچوں کی موجودگی کی وجہہ سے لوگ اُدھر جاتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ کتابوں کی نوعیت اور اپنی عمر کی مناسبت سے وہ اس جگہہ کھڑا ہوا کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے سرخ گلاب کا ننہا پودا سرسوں کے زرد کھیت میں کھڑا ہو۔

بالآخر دوکاندار سے نہیں رہا گیا۔

وہ اپنی جگہہ سے اٹھا اور راہ میں پڑنے والی دو ایک گھومنے والی شیلفوں پر کتابوں کو درست کرتا ہوا لڑکے تک پنہچا اور بولا

"سوری مدد چاہئے؟ کوئی خاص کتاب ڈھونڈھ رہے ہیں آپ؟"

لڑکے نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک کتاب کو اپنی طرف انگلی سے جھکاتے ہوئے

"مسٹر فلاں" کہا

دوکاندار نے تھوڑے توقف سے، جیسے وہ بھی شیلف کی کتابوں پر کھوجنے والی نظر دوڑا رہا ہو، آہستہ سے کہا

"سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی الماری کی سب سے نیچے کی شیلف میں دائیں طرف سے تیسری کتاب"

اسی وقت ایک صاحب نے تقریباً اسکی آنکھوں میں ایک بڑی سی کتاب کو گھساتے ہوئے کہا

"اس پر قیمت نہیں لکھی ہے!"

دوکاندار نے بغیر جھجکے ہوئے، نسبتاً اونچی آواز میں، بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا

"For that you have to place an order —

(آرڈر پر منگوائی جا سکتی ہے) غالباً ۳۵- آپ آئیے میرے ساتھ"

پہلی بات کے کہنے میں وہ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھ چکا تھا اور دوسری بات اس نے اُن صاحب سے معذرت بھرے لہجے میں کہی تھی۔

لڑکا، دوکاندار اور گاہک سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے اور تھوڑی دیر کے لئے دوکان میں مکمل خاموشی ہو گئی، سوائے اس کے کہ کسی کے ورق پلٹنے کی سوأپ یا دوبارہ شیلف میں کتاب کو رکھنے کی کھٹاک کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔ دبلا لڑکا اُس شیلف کے سامنے سے ہٹ کر فلسفے والی شیلف کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دوسرے لوگ اپنی جگہیں اس الماری سے اُس الماری کے لئے بدل رہے تھے اور دوکاندار بھی مختلف شیلفوں پر کتابوں کو دوبارہ ترتیب سے رکھ رہا تھا۔

ایک بار لڑکے نے جب اپنی چھٹی حس سے اس کی طرف گھوم کر دیکھا

تو وہ کاؤنٹر کے پاس رکھی ہوئی الماری کی سب سے نیچے کی شیلف میں کتابیں ٹھیک سے جما رہا تھا۔
یہ الماری سب سے پرانی تھی اور سب سے کم اہم جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔
لڑکے نے ایک بار پھر باہر نظر دوڑائی اور آکاش کی طرف دیکھا جہاں بادل لدے کھڑے تھے۔

*　*　*

جو آدمی دھنیئے کی دوکان میں کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا ایکدم چونک کر بولا
"ابھی تک تو کوئی نہیں آیا"
دھنیئے کے ہاتھ رک گئے اور اس نے پوچھا "کیا کہا آپنے؟"
وہ آدمی بولا "کچھ نہیں۔ میری سائیکل کی گدی بھیگ گئی ہے اور اُس پر بیٹھنے کے بعد یہ پتلون اب دو دن نہیں کھینچے گی"
دھنیا بولا "آپ نے کچھ اور کہا تھا"
"ہو سکتا ہے" اُس آدمی نے کہا "تم روئی دھنے جاؤ اور سکھ کی کھاؤ"۔
"سکھ کی تو آپ کھاتے ہیں" دھنیئے نے روئی کا ڈھیر سمیٹتے ہوئے کہا۔
"واقعئی؟"
"اور کیا۔ گھنٹہ بھر یہاں بیٹھنے میں آپکو پچاس بار تو دھسکا اٹھتا ہے — اور میری ناک اور حلق میں دن بھر روئی ہی روئی گھستی رہتی ہے۔ روزی روزی سب برابر ہے، کسی کو بیٹھے

بھیجے ملتی ہے اور کسی کو زمین پر چ ... گھس گھس کر"
وہ آدمی ہنس پڑا اور بولا
"اچھا تو گھسے جاؤ۔ تمہارے نصیب میں یہی لکھا ہے۔ پچاس بار سمجھایا کوئی اور کام سیکھو اور باہر نکل جاؤ۔ بھلا یہ دیس بھلے آدمیوں کے رہنے کا ہے؟"
دھنیا بولا "ہم جاہلوں کو بھلا کوئی اور دیس کیوں لینے لگا! آپ چلے جائیں، پڑھے لکھے ہیں"۔ پھر اُس نے مسخرے پن سے کہا "اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو بہت طرح کے کام آتے ہیں"۔
"مثلاً؟" وہ آدمی بولا۔
"جیسے یہی جو آپ کر رہے ہیں"
"میں تو خیر جلد ہی باہر چلا جاؤنگا" وہ آدمی بولا "پھر تم دیکھنا میرے ٹھاٹ۔ کتنی جلد میرے پاس ایسی کار ہوتی ہے جیسی تم ہالی وڈ کی فلموں میں دیکھتے ہو۔ ہر چیز نئی"۔
دھنیا بولا "بیوی بچے بھی نئے"

آدمی باہر دیکھنے لگا جہاں اب بارش موسلادھار ہو رہی تھی۔ اس نے شام تک یہاں بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسکے بعد دھنیا اپنے گھر چلا جائیگا اور اگر اُس وقت تک کچھ نہیں ہوا تو پھر اُسے اس جگہہ سے ہٹ کر کوئی دوسرا مورچہ سنبھالنا ہوگا۔ چائے خانہ یا مٹھائی کی دوکان۔
لیکن وہ دونوں سامنے والے گھر کی کھڑکی کے اندر کا حصہ اتنی اچھی طرح نہیں دکھا سکتی تھیں جتنی یہ دھنیے کی دوکان۔ اسکے علاوہ مشکل یہ تھی کہ چائے خانے میں سب ہی طرح کے آدمی

بیٹھتے تھے۔ اسکے نئے پرانے اسکول کے شاگرد بھی اور لکھنے لکھانے والے بھی۔ وہ جو جرائیم کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے اور وہ جو لکڑی کے کیبنوں میں کچی ٹھنڈی زمین پر اسکے ساتھ بیٹھ کر کبھی کبھی اپنے زندگی کے خلا کو چرس اور کوکین سے پر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

لیکن مشکل یہ تھی اگلی صبح آنکھ کھلنے پر زندگی کا خلا اور بھی زیادہ بھیانک طریقے سے منہہ پھاڑے کم سے کم خود اُسے نگل لینے کو تیار نظر آتا تھا۔

بہرحال آج وہ نہیں چاھتا تھا ایسے موقع پر کوئی اُسے پہچانے۔۔ کیونکہ سب کو اسکے بارے میں شبہہ تھا
اور سب کے بارے میں اُسے شبہہ تھا۔

مٹھائی کی دوکان اور بھی زیادہ بے موقع تھی کیونکہ بجائے سامنے والے مکان کے مقابل ہونے کے وہ مکانوں کی اُسی قطار میں نکڑ پر بنائی گئی تھی اور یوں بالخصوص اندھیرے میں اسکے لئے یہ جاننا مشکل ہوتا کہ کون کون اس عمارت میں داخل ہو رہا ہے۔ دھنیے کی دوکان میں بیٹھنے کا ایک اور فائدہ بھی تھا۔ سامنے کی عمارت میں — جسکی دوسری منزل پر اُسے نظریں جمائے رکھنی تھیں — نیچے کی منزل کی ایک چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے وقتاً فوقتاً اُسے گھر والی کا چہرہ نظر آجاتا تھا۔ جوں ہی سڑک پر کچھ ہوتا تھا مثلاً لوگوں میں تو تو، میں میں یا کسی طرح کا شور شرابا وہ فوراً ادھر کھلی کھڑکی کے پیچھے آن کھڑی ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا دل بستگی کے لئے اسکی زندگی میں اور کچھ نہیں تھا — نہ بچے نہ کوئی موسیقی کا آلہ۔

پہلے بھی ایک آدھ بار اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اُس چہرے والی

کے وصف میں کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن نوٹ بک کے خالی صفحے تک پنہچنے میں اس قسم کے اندراجات راہ میں حائل ہوتے تھے۔

۳ مارچ۔ دو آدمی۔ ایک وہ جو لیکھکوں کے کلب میں پورے وقت خاموش بیٹھا رہتا ہے اور دوسرا ب۔ ک۔ م۔ فلاں سڑک کے کنارے کھڑے لیچی کھاتے نظر آئے۔ ب۔ ک۔ م۔ مجھے دیکھ کر انجانا بن گیا اور میں سائیکل پر اُن کے سامنے سے گذر گیا۔

۱۸ اپریل۔ ب۔ ک۔ م۔ لیکھکوں کی بیٹھک میں آج بھی آیا تھا۔ اسکے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو میرا خیال ھے کسی کرنل جنرل کی لڑکی ھے اور جسے میں نے ایک بار اندھیرے میں فلاں اسکوئیر کی ایک بلڈنگ کی پچھیت کی دیوار کے پاس سے آکر کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ کار کے چلے جانے کے بعد میں نے اس دیوار کا جائزہ لیا تھا اور اس پر چپکے ہوئے پوسٹر کو میں اتارنے میں کامیاب ہوگیا تھا کیونکہ اسکے پیچھے لگی ہوئی لئی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی۔

۱۰ مئی: اژدھام۔ ھر کوئی۔ ب۔ ک۔ م۔، د۔ ھ۔ د، چینا، کرنل جنرل کی جاپانی گڑیا، لوکوشیڈ کا شفٹ انچارج، ریلوے ورکرز اور اُن میں چھپا ہوا ھاری کرشنا ھاری راما جس نے مجھے دیکھ کر دائیں آنکھ ماری اور جواب میں، میں نے بائیں۔ ھاری کرشنا ھاری راما ان لوگوں کے ساتھ مل کر نعرے لگا رہا تھا لیکن ب۔ ک۔ م۔ اور کرنل جنرل کی بیٹی نے چپ سادھ رکھی تھی، چینی

شکل والا بھی ان ہی کی طرح خاموش تھا۔ تینوں کے ہاتھ میں کوئی جھنڈا بھی نہیں تھا۔ مزدور مہنگائی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک کہتا تھا "کیا بدلا ہے؟"

اسکے ساتھی نعرہ لگاتے تھے "کچھ بھی نہیں"
پھر وہ 'گھونس اُپواس' (رشوت، فاقہ) — 'ہائے! ہائے!' 'دھوکے کی ٹٹی' — 'ہائے! ہائے!' کے نعرے اُس rhythm ردم پر لگانے لگے جس پر ایس۔ یو۔ بلی نے اپنی نئی فلم May 1 (یکم مئی) کی موسیقی بنائی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ May 1 کو نمائش کی اجازت سرے سے ملی ہی نہیں تھی یہ تھیم میوزک کیسے بازار وکوچہ میں پہنچ گئی؟ مجھے کسی دن فلم کے ڈائریکٹر، پروڈیوسر، لیکھک ر۔ ن۔ م۔ سے جیل میں جا کر ملنا چاہئے۔ وہ ہی بتا سکے گا کہ جب ریلیز سے پہلے میوزک کسی نے نہیں سنی تھی تو اب پابندی لگنے کے بعد وہ کیسے ہر ایک کے لب پر ہے۔

اس لحاظ سے اُس پر دونا جرم عائد ہوتا ہے۔

مجھے ہجوم میں وہ نوجوان بھی نظر آیا جس پر پیغام رسانی کا شبہہ مجھے اور ہاری کرشنا ہاری راما دونوں کو عرصہ سے ہے۔ جس نے پچھلے سال مجھے ایک دن بہت تنگ کیا تھا۔ مجھے شک تھا وہ خفیہ ڈاک لیکر جا رہا تھا۔ چنانچہ ب۔ ک۔ م۔ کے گھر سے میں اسکے پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ اس نے ایکا ایکی سائیکل اندھا دھند دوڑانی شروع کردی جیسے

موٹر سائیکل پر سوار ہو۔ میرا شک اور بھی پختہ
ہو گیا اور حالانکہ یہ کام میرے لئے مشکل تھا لیکن
اسی مناسبت سے مجھے بھی سائیکل کی رفتار کو تیز
کرنا پڑا۔ پھر بے وجہہ اس نے سائیکل کی رفتار اتنی
ہلکی کردی جیسے slow race (دھیمی دوڑ) ہو رہی
ہو اور مجھے تھوڑی دیر کے لئے درمیانی فاصلہ برقرار
رکھنے کے لئے سائیکل سے اتر کر اسکے پیچھے پیچھے
چلنا پڑا۔ تب ہی اس نے مجھے تنگ کرنے کے لئے
ایکدم سائیکل بھگانی شروع کردی۔ یہ کھیل اس نے
تین چار بار کھیلا اور جب وہ اجانک کس وقت میری
نظروں سے اوجھل ہو گیا تو مجھے پتہ چلا کہ میں
ب۔ ک۔ م۔ کے گھر سے بمشکل چند گز کے فاصلے پر
دوبارہ کھڑا بے طرح ھانپ رہا ہوں۔

۸۔ مئی: ب۔ ک۔ م۔ لیکھکوں کی ہفتہ وار بیٹھک سے اٹھ کر
پیشاب کرنے کے لئے باہر گیا تھا۔ یہ بات مجھے
ہاری کرشنا ہاری راما نے بتائی تھی۔ میٹنگ میں میں خود
نہیں گیا تھا کیونکہ مجھے دھڑکا تھا کہ اگر آج گیا
تو دھر لیا جاؤنگا اور مجھ سے اگلے ہفتے کچھ پڑھنے
کے لئے کہا جائیگا۔ میرا خیال ہے اس بارہ مئی کو
مجھے کچھ لکھے ہوئے پورے پانچ سال ہوجائینگے۔
مجھے لگتا ہے جیسے میرے دماغ کے سوتے سوکھتے
جا رہے ہیں۔ یا سوکھ گئے ہیں اور باوجود روز سر میں
تیل ٹھکوانے کے مجھے نیند صبح ۳ بجے سے پہلے نہیں
آتی ہے۔ مجھے کسی سائیکیٹرسٹ سے مشورہ کرنا چاہئے۔

مثلاً ڈاکٹر س — سے۔ اس میں دھرا فائدہ ہے۔
ڈاکٹر س — کو کریدا بھی جا سکتا ہے کیونکہ وہ
یکم مئی کو ب۔ ک۔ م۔ سے ملے تھے۔

Important: ڈاکٹر آر۔ سی۔ کے۔ کو جو رقم ابھی
تک میں نے بطور فیس دی ہے اُسے ۳۰ جون سے پہلے
پہلے کلیم claim کرنا ہے۔

V.Important: دواؤں کے بلوں کا Reimbursement
کل رقم ۵۴۶۔

ھاری کرشنا ھاری راما نے یہ بھی بتلایا ب۔ ک۔ م۔
واقعتی پیشاب کرنے گیا تھا کیونکہ اس نے جب ناک
سنکنے کے بہانے بیٹھک سے اٹھکر اس جگہہ پر نظر
دوڑائی تو وھاں اُسے سرخ مٹی پر ایک گیلا دھبہ نظر
آیا اور سیٹنگ میں سے کوئی دوسرا شخص ب۔ ک۔ م۔
سے پہلے اس طرف نہیں گیا تھا۔ نہ ہی ب۔ ک۔ م۔
وہاں کوئی کاغذ چھوڑ کر آیا تھا۔

یہ ھاری کرشنا ھاری راما کی سخت کمزوری ہے کہ
وہ صرف لیکھکوں کی بیٹھک میں آنے والوں کے نام
اور انکی چلت پھرت پر نظر رکھتا ہے۔ میرے ذھن
میں انکی تحریر کا ایک ایک لفظ رھتا ہے — کس نے
کیا پڑھا اور کیا کہا لوگ بے وجہہ مجھے ساؤنڈ ریکارڈنگ مشین
نہیں کہتے ہیں۔ نہ ہی میں بے وجہہ اُس مسخرے
کو ھاری کرشنا ھاری راما کہتا ہوں۔ اگر گلے میں
دو چار مالائیں ڈال کر وہ سان فرانسسکو پنہچ جائے
تو وھاں اسکی پوجا ھوجائے۔

جون۔ کرنل جنرل کا اپنی لڑکی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔
وہ اسکی پہلی بیوی سے ہے جس سے اسکے تعلقات منقطع
ہیں۔ سننے میں آیا ہے دوسری عورت سے اس نے شادی
نہیں کی ہے۔ دونوں صرف ساتھ رہ رہے ہیں۔

بارش تھم گئی تھی۔ ایک پٹ نالے سے پانی زور سے گر رہا تھا۔
اوپر کی کھلی ہوئی کھڑکی سے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہاں کوئی
بھی متنفس موجود ہے۔ البتہ عین اس کھڑکی کے نیچے کی ادھ کھلی
کھڑکی کے پیچھے اُسے وہی خوبصورت چہرہ نظر آیا۔
دھنیے نے اسکی طرف مسکرا کر معنی خیز نظروں سے دیکھا۔
وہ بھی مسکرا دیا اور کچھ گنگنانے لگا۔
دھنیے نے کہا ”ایک بات پوچھوں؟“
”پوچھو“ اس نے کہا
”آپکو اوپر کی کھڑکی پر نظر رکھنے کا حکم ملا ہے یا نیچے
والی پر؟“
اس نے دھنیے کو سگریٹ دیتے ہوئے کہا ”دونوں پر۔ لو پیو“
”پیسے کس کے ملینگے؟“
”اوپر والی کے“
”وہ تو خالی ہے“ دھنیئے نے کہا
”رات تک بھرجائیگی“ اس آدمی نے کسلمندی سے کہا ”دیکھنا کیسے
چوہوں کی طرح سب اپنی اپنی بلوں سے نکل کر یہاں پہنچ
جاتے ہیں“
”آپ ان لوگوں کے پیچھے کیوں پڑے ہیں صاحب؟“

"جس طرح تم اس روئی کے پیچھے پڑے ہو" اُسے اپنے مکالمے پر تعجب ہوا اور ایک لمحے کے لئے احساس ہوا کہ وہ اگر چاہے تو ابھی بھی بہت کچھ لکھ سکتا ہے — حتیٰ کہ فلموں کے مکالمے بھی۔

پھر اس نے تلخی سے کہا "اپنا اپنا دھندا ہے"

دھنیا اٹھکر اپنی کمر سیدھی کرنے لگا اور بولا "دھننکنے کے بعد یہ تو آپکے کام آئیگی۔ ان بیچاروں کو دھنک کر آپکو کیا ملے گا!"

"بیچارے" اس نے ایسے کہا جیسے اس کے منھ میں پتے کا پانی اُبل کر بھر آیا ہو "تم بھی ان کے ساتھی نکلے؟ ہاتھ آجائے دو پھر تم خود ان کا انجام دیکھ لینا — سب دیش بدروھی اور راج ورودھی ہیں"

دھنیے نے کہا "میں کسی کا ساتھی واتھی نہیں ہوں۔ آپ مائی باپ ہیں وہ بہن بھائی۔ کیسے؟ ایسے، کہ انکی کوکھ بھی ویسے ہی جلتی ہے جیسے میری اور میری گھر والی کی۔ پانچ سال پہلے تک تو آپ بھی ان ہی کے ساتھی تھے۔ میں سوچتا ہوں ایکا ایکی بدل کیسے گئے؟"

"سب بدل جاتے ہیں" اس آدمی نے کہا "تم نہیں بدل گئے؟ پہلے تمہارے گھر میں بجلی تھی؟ اب ہے۔ پہلے ٹرانزسٹر ریڈیو کیسٹ تھا؟ اب ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے" دھنیے نے کام پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہی کہ یہ ترقی ہے اور تمہارے سامنے والے، بلوں میں چھپے ہوئے چوہے جنتا کو پٹی پڑھاتے رہتے ہیں کہ کیا بدلا ہے؟ کچھ بھی نہیں، میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے"۔

دھنیے نے کہا "اب میں کیا بتلاؤں آپکو۔ آپ پڑھے لکھے آدمی

ہیں، میں جاھل جپٹ۔ پر حالت تو پہلے سے بھی خراب ہے۔ ٹیپ رکھنے سے آدمی کی زندگی تو نہیں بدل جاتی۔ میرے پاس بھی کچھ جمع جتھا ہوتی تو یہ تانت چھوڑ کر کب کی مشین لگا چکا ہوتا۔ میرے یہاں تو مندا ہی مندا ہے۔ بچوں کو اسکول پانی ساتھ لیجانے کے لئے پلاسٹک کی بوتلیں بھی نہیں خرید سکتا اور اسکولوں میں پانی تو کیا دھوپ سے بچنے کے لئے چھتیں بھی نہیں ہیں“۔

وہ آدمی بولا ”تب ہی تو کہتا ہوں یہاں سے نکل جاؤ“

”کہاں کو؟“ دھنیے نے کہا ”جنگل کو؟“

اور جب اُسے جواب نہیں ملا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا — اسکا مہمان اپنی کرسی سے اٹھکر دوکان کے اس اندھیرے کونے میں جا کھڑا ہوا تھا جہاں سے پوری سڑک پر نظر دوڑائی جاسکتی تھی۔ اور اس چہرے پر بھی۔

دور سے بھچ بھچ کرکے کسی کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ جلد ہی جوتوں کی آواز کے ساتھ ساتھ لوگوں کے بولنے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

دو آدمی سر پر پولتھین کے بڑے بڑے تھیلے برساتی کی طرح اوڑھے ایک طرف سے آئے اور سامنے والی عمارت کی برابر کی گلی میں مڑگئے جدھر سے زینہ اوپر چڑھتا تھا۔

اس نے پھرتی سے جیب سے نوٹ بک اور بال پائنٹ پین نکالے اور لکھنے کیلئے مستعد ہوگیا۔

اوپر کی کھڑکی میں ابھی تک زندگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا انکے تعقب میں گلی میں جائے۔ آخر وہ کون تھے؟

اگر اُن میں سے کوئی ایک وہ تھا —! یا یہ کہ دونوں ہی میٹنگ میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دونوں اپنے سر پر بوجھے لادے واپس آتے نظر آئے۔ ایک بانسوں کے گٹھے تلے دبا ہوا تھا اور دوسرے کے سر کو جستے کی چادر نے چھپا رکھا تھا۔

اس نے لکھا 'دو آدمی۔ شاید ان کے مکان کی چھت طوفان اور بارش میں اڑ گئی ہے۔ شکل سے ریلوے کے مزدور'

پھر اس نے اپنی تحریر کو غیر ضروری سمجھ کر اس پر لکیر پھیر دی۔

اس تمام ماحول سے بلکہ خود اپنے آپ سے وہ بیزار نظر آ رہا تھا۔

عورت گھر کے کام کاج میں لگ گئی تھی۔ تیسرے پہر کی دھوپ میں چند لدھڑ سے مکمل سیاہ کوئے اس طرف سے اڑتے ہوئے آئے جدھر سے اُسے اُن لوگوں کے آنے کی توقع تھی اور سامنے والے مکان کی چھت پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔

اُسے اپنے ھاتھوں میں کچھ لکھنے کی بے چینی سی محسوس ہوئی

اور عبارت اس نے اپنے ذہن میں دہرائی 'چند بارش سے بھیگے ہوئے

کوئے جنکا بظاہر اس تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے'

پھر وہ اپنے خیال پر ہنس پڑا۔ اس خاموش ماحول میں اُسے اپنی

ہنسی سے ڈر محسوس ہوا۔

دھنیا اپنی بجھی ہوئی سگریٹ کو دوبارہ سلگا کر پیٹھ کو دیوار

سے لیگے چھت کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اسکے بیٹھنے کا انداز

کچھ ایسا تھا جیسے اپنی طاقت نہیں اس نے روئی کے اس دریا میں

اپنی کشتی کے پتواروں کو پانی سے نکال کر تختے پر رکھ دیا تھا
اور کشتی صحیح دھارا میں پڑ کر خود بھی جا رہی تھی۔
وہ دروازے پر لچا باہر کی دنیا کو دیکھتا رہا۔ چل چل کرتی
ہوئی دھوپ جو بادلوں کے چھٹ جانے پر نکل آتی ہے۔ اکا دکا
عورتیں۔ دور کے ایک جوہڑ میں چھپ چھپ کرتے ہوئے بچے جو
پیشاب، لید اور گوبر ملے ہوئے برسات کے پانی میں مگن ہو کر
نہا رہے تھے۔ پھر ایک عورت کی آواز سنائی دی
"ارے سریلیئے لوٹ آ۔ گندے پانی میں نہانے سے بعد میں بدن
پکے گا۔ پھڑئیں نکلیں گی"
بارش کے پانی سے دھل کر سڑک نکھر گئی تھی اور اسکے کنارے
کھڑے ہوئے درختوں کے دھلے دھلائے پتے بھی ہوا میں جھرجھریاں
لے رہے تھے۔

بغیر دھنیئے سے کچھ کہے ہوئے وہ چہرہ نیچے کیئے دوکان
سے باہر نکلا اور تیزی سے سامنے والے مکان کے اُس حصے کی
طرف گیا جدھر سے اوپر کے مکان کو زینہ جاتا تھا۔
اوپر دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔
اطمینان ہوجانے پر وہ دوبارہ اپنے مستقر پر لوٹ آیا
کچھ دیر بعد ایک آٹھ دس سال کی لڑکی چھت پر آئی اور ایک
پیر پر پھدک پھدک کر چلنے لگی۔ پر وہ چھت کے دوسرے سرے
کی طرف پھدکتی ہوئی چلی گئی اور اسکی آواز سنائی دی
"ہاں چھت پر پانی کھڑا ہے"۔
تھوڑی دیر بعد سفید بلاؤز اور ہلکے نیلے اسکرٹس پہنے دو اُس
سے بڑی عمر کی لڑکیاں چھت پر نمودار ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں

میں پانی الیچنے کے اسپنج لگے ڈالے تھے۔ آتے ہی دونوں اپنے کام میں تندھی سے لگ گئیں اور ایک دو مرتبہ پت نالوں سے چھت پر رکا ہوا پانی ریلے کی شکل میں زور سے نکلا
ابھی دن کے آخری دو گھنٹے باقی تھے۔ سورج آکاش کے ایک کونے پر قبضہ کئے بیٹھا تھا اور بادل اسکے چہرے کو پونچھتے ہوئے ہوا میں ایک طرف کو بہتے چلے جا رہے تھے۔

ایک لڑکا سائیکل پر چائے خانے والی سمت سے آتا ہوا نظر آیا۔ وہ ہولے ہولے سائیکل چلا رہا تھا جیسے کسی مکان یا دوکان کی کھوج میں ہو۔ دھنیئے کی دوکان کے پاس پہنچ کر وہ سائیکل سے اتر پڑا اور ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔
اس احساس سے کہ وہ آدمی اسکی طرف دیکھ رہا تھا لڑکے نے خفت مٹانے کیلئے قمیص اپنی پتلون سے باہر نکالی اور اس کے سائے سے اس سیاہ دھبے کو چھپانے لگا جو سائیکل کی گدی نے پتلون کی پچھاڑی پر چھاپ دیا تھا۔
پھر وہ دھنیئے کی دوکان کی طرف آیا اور دونوں آدمیوں سے بولا
"آپکو فلاں آدمی کا گھر معلوم ہے؟"
آدمی نے دیکھا اسکے اوپر کے ہونٹ کا رواں کچھ کچھ سیاہ اور قدرے سخت ہو چلا تھا۔ ٹھوڑی کے نیچے ملایم بال بھی اپنی حقیقت منوانے کے لئے بیتاب تھے۔
"کیوں کیا بات ہے؟" اس آدمی نے پوچھا
"وہ سامنے والا ہے اوپر کا" ساتھ ہی دھنیئے نے کہا
"میرے باپ کی رقم اسکے ذمے پچھلے تین سال سے نکلتی ہے —
رقم ادا کرتا نہیں مکان بدلتا رہتا ہے۔ جب جاؤ پتہ چلتا ہے

ہاں سے مکان چھوڑ گئے"۔

دمی نے بے صبرے پن سے کہا "فوراً جاؤ۔ تمہیں ڈوج dodge
ے رہا ہے۔ اس وقت یہیں ہے"۔

ڑکا جانے کے لئے مڑا۔ اسکے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ دونوں
ے اُسے عمارت کے برابر کی گلی میں مڑتے دیکھا اور ایک دوسرے
کو پرکھنے والی نظروں سے۔

ھنیئے کا چہرہ بے تاثر رہا۔ اس آدمی کی آنکھوں میں چمک
آتی گئی۔

اوپر کے کمرے میں ابھی بھی مکمل خاموشی تھی۔ آدمی چاہ
رہا تھا لڑکا جلد سے جلد لوٹ آئے تاکہ وہ اس سے پوچھ سکے
اوپر کے کمرے میں کل کتنے آدمی ہیں۔ اُسے لگ رہا تھا کسی
خفیہ دروازے سے کچھ لوگ اوپر کے کمرے میں پہنچ چکے ہیں
اور وہاں میٹنگ ہو رہی ہے۔

وہ اٹھکر مکان کے کونے تک گیا۔ دھنیا دوکان کی چوکھٹ پر کھڑا
ہوکر انگڑائی لینے لگا۔ تب ہی آدمی کو لڑکے کے زور زور سے
بولنے کی آواز سنائی دی

"میرے باپ کہتے ہیں تم نے اگر دس دن کے اندر اندر رقم
واپس نہیں کی تو اُن سے برا کوئی نہیں ہوگا"۔

اُسکی آواز اور نزدیک آ گئی

"انہوں نے کہا ہے بعد میں مت کہنا کہ کیوں پولیس اسٹیشن
میں رپورٹ لکھوائی"۔

وہ جھلایا ہوا گلی سے نکلا جیسے منہہ ہی منہہ میں گالیاں
دے رہا ہو۔

لیکن وہ آدمی یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ اُسے اس قضیے میں کوئی

دلچسپی نہیں تھی اسی اثنا میں چائے خانے کی طرف چل دیا تھا اور عمارت کے دوسرے کونے تک پہنچ چکا تھا۔

لڑکا بغیر اسکی طرف دیکھے سائیکل پر بیٹھ کر مخالف سمت میں چل دیا جدھر لوکوشیڈ تھا اور ریلوے کراسنگ کے بعد لکڑی کے سلیپروں کے ڈھیر، ختم ہوجانے والی ریل کی پٹریوں کے لئے زمین پر لگائے ہوئے بفر اسٹاپس buffer stops اور ادھر اُدھر پٹری سے اتار کر رکھے ہوئے مال گاڑی کے ڈبے نظر آتے تھے۔ بفر اسٹاپس buffer stops کے ان بفرز buffers پر دن میں بچے چڑھے رہتے تھے اور مال گاڑی کے خالی ڈبوں میں سے کسی میں کوئی وہ رہا تھا کسی میں کسی نے بطخیں پال رکھی تھیں۔ بعض بعض ڈبوں پر بیلیں بھی چڑھی ہوئی تھیں جن میں نیلے پھول کھلتے تھے۔

سڑک پر جگہہ جگہہ پانی کے پوکھر سے بن گئے تھے۔

لڑکے نے ایک جگہہ پانی میں سے گذرتے ہوئے اپنے دونوں پیر اٹھا کر بائیسکل کے ہینڈل پر رکھ لیئے۔ بائیسکل سے پانی پھٹ کر جھالروں کی طرح دونوں طرف اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ پانی ختم ہوجانے پر وہ بائیسکل سے اترا اور اگلے پہیئے کی ہوا ٹیسٹ کرتے ہوئے اُسنے اس طرف نظر دوڑائی جس طرف سے وہ آیا تھا۔

اُدھر مطلع صاف تھا اور دور آسمان میں ایک بہت بڑا > کا سیاہ ہندسہ اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا وہ مرغابیاں تھیں اور سورج کی کرنوں نے آسمان میں انکا ایک متحرک سلہوٹ بنا دیا تھا۔

اُسے انکا آزادی سے اڑنا اچھا لگا اور جواب میں اُسنے سائیکل کو خالی سڑک پر ایک دائرے کی شکل میں چکر دیا — پھر وہ اپنے گھر کی طرف دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھائے چل پڑا۔

اسکی آواز سن کر چھوٹی بہنیں باہر نکل آئیں اور سیر کرانے کے لئے ضد کرنے لگیں۔ بلکہ سب سے چھوٹی ایکدم آگے کے ڈنڈے پر ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اس کی پگ ٹیلز pigtails لڑکے کے منہہ کو سہلا رہی تھیں۔ دوسری بہن اس سے نیچے اترنے کے لئے کہہ رہی تھی

"تم صبح بیٹھ چکی ہو۔ اب میری باری ہے"

"نہیں میری باری ہے" بچی نے کہا "میری باری ہمیشہ رہتی ہے"۔ اندر سے لڑکے کی ماں کی آواز آئی "ابھی کہیں جانا ہے؟"

لڑکے نے کہا "نہیں مما"

عورت نے کوارٹر کے دروازے پر آکر کہا "کسی کی باری واری نہیں ہے۔ مجھے پاپڑ اور سوکھی۔ املی منگوانی ہے"

لڑکے نے سوکھے ہوئے منہہ سے کہا "مجھے پڑھنا ہے۔ پاپڑ اور املی میں رات کو بھی لا سکتا ہوں۔ وائیٹا لنگھم پلائے کی دوکان دس بجے تک کھلی رہتی ہے"۔

"ابھی کیوں نہیں چلتے بھائی۔ میں دوکان پر کچھ لینے کی ضد نہیں کرونگی۔ promise"۔ چھوٹی لڑکی نے کہا۔

لڑکا ہنس پڑا اور بولا "اچھا چلو"۔

باقی بچے کچھ دور تک اسکے پیچھے بھاگے۔ دور سے پہلے الیکٹرک انجن کی سیٹی کی آواز آئی اور پھر ٹرین کی آواز میں ملی ہوئی اسکی ماں کی "واپس آکر مجھے سائیکل پر اپنے ماموں کے گھر چھوڑ کر آنا"۔

سب کاموں سے نمٹ کر جب لڑکا اپنی physics فزکس کی کتاب لے کر اپنے کوارٹر کے باہر بینچ پر بیٹھا تو کمزور سی دھوپ

اسکے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ سے مطمئن نظر آ رہا تھا اور اپنی ذہانت پر خوش تھا۔ بالخصوص جس طرح اس نے خط مسٹر فلاں کو اپنی پتلون کے سڑے ہوئے پائینچے میں سے نکال کر دیا تھا جب وہ انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا۔

اسکی بہنیں اب بیر بہوٹیاں جمع کرتی پھر رہی تھیں۔ بڑی نے گن کر کہا ”میرے پاس آٹھ ہوگئیں“

اسکا چھوٹا بھائی جو اس کھیل میں شریک نہیں تھا اور ان دونوں سے بڑا تھا حقارت سے بولا ”دو سال ہوئے میں نے اکیس پکڑی تھیں“۔

چھوٹی لڑکی نے اسکی کتاب پر اپنی بند مٹھی رکھ کر کھول دی اور بولی ”بھائی میری کتنی ہیں؟ گن دو“

”پانچ“ لڑکے نے ورق پر سے پھونک مارکر مٹی اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری پھونک سے تو میری ایک بیر بہوٹی ہی اڑ گئی“ بچی نے کہا۔

* * *

جب دھنیے کے دوکان بند کرنے کا وقت آیا تو احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر وہ آدمی سر اٹھائے باہر سڑک پر نکل آیا۔ اُسے تعجب ہوا وہاں بیٹھے بیٹھے اُسے یہ احساس تک نہیں ہوا تھا کہ مکانوں اور دور کی دوکانوں میں کب کی بتیاں جل گئی تھیں اور سامنے کی عمارت میں بھی اوپر اور نیچے کی منزلوں میں روشنی تھی۔

وہ ٹہلتا ہوا زینے تک گیا لیکن اوپر نظر ڈالنے پر ٹھٹک کر رہ گیا۔

وہاں تالہ لگا ہوا تھا۔

دھنیا اپنی راہ چلا گیا اور مجبوراً اپنی سائیکل اٹھا کر اُسے بھی محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔ پہلے اُسنے سوچا کچھ دیر چائے خانے میں بیٹھا جائے۔ پھر اُسے خیال آیا گھر جا کر کپڑے بدلنا بہتر رہے گا۔ یہاں ٹھیرنا اب بیکار تھا۔ پہلے اُسے ہاری راما ھاری کرشنا پر غصہ آ رہا تھا کہ اُسنے غلط اطلاع کیوں دی تھی کہ یہاں میٹنگ ہونے والی ہے۔ پھر اپنے آپ پر آنے لگا کہ اُسے زینے کے سامنے کہیں بیٹھنا چاہئے تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اسکی بیوی چھوٹے بچے کو کوئی مذہبی کہانی سنا رہی تھی۔ اس عورت سے اُسے نفرت تھی جو بچے جنتے جنتے بھینس بنگئی تھی۔

اگر وہ ایک بار یہاں سے نکل سکتا! سب کچھ اس پر منحصر تھا۔ ہر چیز میں سڑائیند، کھکھرائند، بدبو یا پھپھوندی تھی اور خود اسکی طبیعت کو زنگ لگ چکا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے اُسنے بیوی سے کہا ”جب کھانا پک نہیں سکتا ہے تو گوشت، ترکاری اور چاولوں کا زیاں کیوں کرتی ہو“۔

بیوی نے ڈرتے ڈرتے کہا ”کیا ہوگیا آج ؟“

”کچھ نہیں“ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اب پڑوسنوں سے جب جی بھر جائے تب کھانا پکانا“۔

بیوی سسکیاں لینے لگی، ایک ایسی حرکت جس سے اُسے نفرت تھی۔ اس نے کھانے کی پلیٹ کو دور ڈھکیلتے ہوئے بچوں کو للکارا!

”اگر پڑھا نہیں جاتا ہے تو سو کیوں نہیں رہتے ہو۔ بس ہوچکی پڑھائی۔ تم لوگ بڑے ہوکر درمٹ سے سڑک کوٹو گے“

بچے کچھ بستروں میں دبک گئے کچھ گھبراہٹ میں جو کتاب سب سے نزدیک تھی وہی لیکر بیٹھ گئے۔
مکان سے باہر جاتے ہوئے اس نے ایک بچے کے ہاتھ سے فلمی رسالہ کھینچتے ہوئے کہا "یہ اپنے بڑے بھائی کو پڑھنے کو دو۔ انکے کام کی چیز ہے"۔

باہر نکل کر اس نے لکڑی کے کیبن کا رخ کیا، جیسے زندگی کو جلد سے جلد حلق سے نیچے اتر جانے والا لقمہ بنانا چاہتا ہو، سانپ کے منہہ کی چھچھوندر نہیں۔

چرس کے دھوئیں سے بھرے ہوئے کیبن میں پہنچ کر اسکی دن بھر کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جیسے خود بخود دوبارہ زندگی کی جوت جاگ اٹھی۔

اس نے پوڑی کے ٹکڑے کو ماچس کی تیلی کے خالی سرے پر بڑے اہتمام سے مڑھا اور اتنی ہی محبت سے اُسے دوسری ماچس کی تیلی کی لو دکھائی 'جیسے اپنی محبوبہ کی چتا کو کوئی خود اپنے ہاتھ سے آگ لگا رہا ہو'۔
اُسے تعجب ہوا اتنا بڑا لیکھک یا کوی ابھی تک اسکے اندر جاگ رہا تھا۔
پھر اُس نے ایک سگریٹ کو ہولے ہولے مسل مسل کر اسکا تمباکو اپنی ہتھیلی میں نکالا اور اس میں آتش دیدہ چرس کے ٹکڑے کو چورا کر کے آمیز کرنے لگا۔ 'ایک خوبصورت چیز دوسری خوبصورت چیز سے گلے مل رہی ہے'

اور پھر دونوں کاغذ کے ٹیوب میں سما گئیں۔ بچے ہوئے تمباکو کو اُسنے اپنی ہتھیلی پر سے پھونک مار کر ہوا میں اڑایا جو زمین

پر لیٹے ہوئے ایک ساتھی کے چہرے پر جا کر گرا۔

سب چیزیں کتنی چمکیلی تھیں — ہلکورے لیتی ہوئی لکڑی کے کیبن کی دیواریں، ساتھیوں کے رنگین کپڑے، لڑکیوں کی آوازیں جو کہیں دور سے آ رہی تھیں اور ان کے ہاتھ جو اتنے نزدیک تھے کہ وہ انہیں اپنے گالوں اور گردن پر محسوس کرسکتا تھا۔ اس نے دوسرا ریفر reefer سلگا کر زمین پر بیٹھے بیٹھے جیب سے نوٹ بک اور بال پائنٹ پین نکالے اور لکھنے لگا

'ب۔ ک۔ م۔ اپنا افسانہ پڑھ رہا ہے۔ اسکے ساتھ کرنل جنرل کی لڑکی بیٹھی ہے۔ یہ افسانہ سراسر راج کے خلاف ہے'

اسکے ایک ساتھی نے چلا کر کہا "کیا گھنٹے بھر سے زمین پر ماچس کی تیلی سے دنیا کا نقشہ بنا رہے ہو۔ جاؤ گھر جا کے سو رہو"۔

کسی اور نے لہک کر کہا "جاؤ وہاں تمہاری اماں جان انتظار کر رہی ہونگی۔ ان کے بازؤں میں منہہ دیکر سو رہو"۔

* * *

اندھیرے کمرے میں دبلے پتلے پانچ فٹ کے لڑکے نے اس سین کو اپنے دماغ میں دھرایا۔ سیکنڈ ھینڈ کتابوں کی الماری میں سب سے نیچے کی شیلف کی تیسری کتاب۔ جس طرح وہ اس علاقے کی طرف اپنی بائیسکل پر جا رہا تھا کیونکہ یہ کام اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے کرنے کا تھا — اس سے پہلے کہ لوگ وہاں جمع ہو سکیں۔

اس نے اپنے جسم کو بستر پر لمبا کرکے پیروں سے پائینتی کو چھونا

چاھا لیکن ابھی اسکا جسم چھوٹا تھا۔

"So I am a courier already"

اس نے جسم کو اور کھینچتے ہوئے فخر سے سوچا (میں ابھی سے پیغامبر ہوں)۔

لیکن اس کوشش میں اسکے پیر تو پائینتی سے چھو گئے سر البتہ سرھانے سے ایک فٹ نیچے کھسک آیا۔

"What a pity" اُس نے سوچا "I am not big enough yet"

(کیا افسوس ہے میں ابھی تک پوری طرح بڑا نہیں ہوا ہوں)

مخبر

ماہنامہ افکار، کراچی۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

۱۴۱/۳۷، ۵۳ تا ۶۳ اور ۳۶۔

کھوکھلا شہر

سورج ڈوبنے میں گھنٹہ بھر باقی تھا کہ سمندر کی لہریں ایک تختے کو لا کر کنارے پر چھوڑ گئیں۔ پہلے تو تختہ ہر آنے والی لہر کے سر پر تھوڑی دیر کو جھولتا تھا اور پھر ساکت ہوجاتا تھا لیکن جب سمندر دور ہٹتا گیا تو وہ بھیگی ہوئی ریت پر بے جنبش پڑا رہ گیا۔

بیچ خالی تھی اور میلوں تک نہ کوئی کشتی دکھائی پڑتی تھی نہ کسی جہاز کا فنل یا مستول ہی نظر آتا تھا۔

جب تختے پر بندھے ہوئے آدمی نے اپنا سر اٹھایا تو بیچ پر ہلکا سا اندھیرا اتر آیا تھا اور سامنے کنارے پر بنے ہوئے

مکانوں کی قطاریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ مکانوں کی قطاریں دونوں طرف تاحد نگاہ چلی گئی تھیں لیکن کسی بھی مکان میں نہ روشنی نظر آ رہی تھی، نہ ہی کسی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی، خود سمندر کا شور بہت دور چلا گیا تھا۔

اُس نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ آسمان میں جگہ جگہ سرخ دھبے تھے اور بادل ایسے تھے جن سے پانی کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ مکانوں کو دیکھ کر اُس نے سوکھے ہوئے ہونٹوں میں تری محسوس کی۔ لیکن ہونٹوں کو چوسنے پر پتہ چلا کہ اُن پر نمک کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

اپنے آپ کو تختے سے کھول کر وہ کچھ دیر ریت پر بیٹھا رہا اور پھر ہمت کر کے کانپتے ہوئے پیروں سے اُس شہر کی طرف چل پڑا جو اس وقت شام کے سناٹے اور مٹیالے رنگوں میں ڈوبا اس کے سامنے پہاڑی پر ایک طرف سے دوسری طرف کو میلوں سمندر کے کنارے کنارے چلا گیا تھا۔

بھاری تھکے تھکے اور ڈگمگاتے قدموں سے کرن ٹارن نے یہ چند سو گز کا فاصلہ کافی دیر میں طے کیا۔ اُسے بڑے بڑے بولڈرز اور ٹوٹے ہوئے مکانوں کے کنکریٹ کے ڈھیروں کو کتراتے ہوئے آگے بڑھنا پڑا۔ کیونکہ اتنی دیر یا شاید اتنے دن سمندر پر بے کھائے پیئے بہتے رہنے سے اُسے اپنے جسم میں فاقہ زدہ انسانوں کی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا ماتھا جل رہا تھا، ہونٹ تڑخ رہے تھے اور ہاتھ پیر آگے بڑھنے سے انکار کر رہے تھے۔

پہلے مکان کے پاس پہنچنے پر کرن ٹارن جس چیز پر چونکا وہ اس کے اندر کی خاموشی تھی۔ ہر کمرہ بند تھا۔ دروازہ دھپ دھپانے پر بھی اندر سے کسی نے جواب نہیں دیا ــــ

اُس نے سوچا 'کون سا ملک ہے۔ کون سی جگہ ہے۔ کیا یہاں لوگ پوری طرح اندھیرا ہونے سے پہلے ہی سوجاتے ہیں ؟'
لیکن جس چیز نے اُسے بری طرح خوف زدہ کردیا وہ آس پاس کہیں بھی پانی کے نشان کا نہ ہونا تھا کیونکہ نہ شہر میں کوئی نل نظر آتا تھا نہ نالی۔

'ایسا تو نہیں ہے میں بجائے سمندر میں ڈوب جانے کے کسی گوسٹ ٹاؤن ghost town میں آ گیا ہوں۔ یہ تو شہر ہی شہر ہے، آدم نہ آدم زاد — حد یہ ہے کہ کتوں تک کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی ہیں'۔

بچی کھچی طاقت اس خالی خولی شہر کی سیاحی کی نذر کرکے وہ ایک ٹوٹے ہوئے مکان کے فرش پر بیٹھ گیا۔
شاید وہ خدا سے باتیں کر رہا تھا، 'مذاق کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے' وہ منہ ہی منہ میں بڑ بڑایا۔

دوبارہ جب غنودگی ٹوٹی تو ہلکی چاندنی ہر چیز پر چھا چکی تھی۔ سمندر کا شور نزدیک آ گیا تھا۔ بادل چاند کو بھاگتے ہوئے پار کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ پوری کائنات پر قبرستان کا گمان گزرتا تھا — اُس نے سوچا 'یہ جگہ یا تو کوئی آدمیوں کا چھوڑا ہوا شہر ہے جسے ممکن ہے فوجی اہمیت کی وجہ سے اس بے آب و گیاہ پہاڑی پر کبھی بسایا گیا ہوگا، پانی کہیں سے جہازوں میں لایا جاتا ہوگا اور جب جنگ ختم ہوگئی تو فوجی اُسے خالی کرکے اپنے گھروں کو لوٹ گئے یا ہوسکتا ہے کسی بڑے شہر کی بیرونی بستی ہو۔ سیٹیلائٹ ٹاؤن یا سبرب۔ لیکن سبربز (suburbs) میں بھی اتنی خاموشی تو نہیں ہوتی۔ سڑکیں

کہاں ہیں، کوئی نلکا کیوں نہیں ہے۔ نالیاں کیوں نہیں ہیں، لوگوں نے کتے کیوں نہیں پال رکھے ہیں اور خود لوگ کہاں ہیں؟ لیکن اس سے پہلے کہ میں بالکل نڈھال ہوجاؤں ایک کوشش کھانے اور پانی کے لئے اور کر ڈالنی چاہیے۔ باقی کل صبح دیکھا جائیگا۔"

رات بسر کرنے کی جگہ کا تعین کرکے وہ واپس سمندر کی طرف چل پڑا۔ بادل اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے رسی تڑا کر بھاگے ہوں اور اس کے ساتھ نہ آنے کا عہد کر چکے ہوں۔

کنارے کے پاس پہنچ کر وہ مونگے۔(ACORN BARNACLES) سے لسی ہوئی ایک خاردار چٹان پر بیٹھ گیا جس کے دو پاٹوں کے بیچ میں پانی ریلا کرکے آتا تھا اور جھاگ بن کر ہوا میں بکھر جاتا تھا۔ مدھم چاندنی میں پانی کے اُتر جانے کے بعد کے وقفوں میں اُسے پتھروں میں چھپے ہوئے کیکڑے دکھائی دینے لگے جو ہر بار پانی کی لہر کے آنے پر تھوڑے سے اوپر کو ہوجاتے تھے جیسے بھیگ جانے سے ڈر رہے ہوں۔

ادھر اُدھر ہاتھ دوڑانے پر بھی جب اُسے کوئی پتھر نہیں ملا تو وہ اپنی قمیص اُتارنے لگا جو پیٹھ پر چپک گئی تھی۔ قمیص اُتارنے میں اُس نے درد کی ایک سسکاری لی۔ کیونکہ پیٹھ اور بازو دونوں دھوپ سے جل چکے تھے۔ بعد میں چٹان پر لیٹ کر جب وہ ایک بڑے سے کیکڑے پر اپنی قمیص پھینک رہا تھا تو ایک لہر اس کے بازو کو بھگو گئی اور نمک لگنے پر اُسے احساس ہوا اُس کی کھال کتنی زخمی ہے۔ لیکن کیکڑا قمیص کے نیچے حرکت کر رہا تھا اور خطرہ تھا دوسری لہر کے آنے پر وہ کہیں اُسے جل دے جائے۔

اُس نے پھرتی سے ریت پر کود کر اُسے اپنے پیر سے کچل ڈالا

اور تلووں کے نیچے اس کے خول (SHELL) کو چٹختا ہوا محسوس کیا ——

تھوڑی دیر بعد قمیص کے نیچے کی حرکت رک گئی اور ہاتھ سے چھونے پر بھی کیکڑے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں نے جنبش نہیں کی۔ قمیص میں ان ٹکڑوں کو سمیٹ کر وہ خشک ریت پر جا کر بیٹھ گیا۔

شہر اُسی طرح گنگ تھا اور جو مل گیا تھا اس سے زیادہ کی توقع بیکار تھی۔ کرن ٹارن نے انگلیوں سے شیل میں بھرا ہوا ٹھنڈا گودا کھود کر نکالا اور اُسے ہونٹوں پر پھیر کر دیکھا۔ پھر ایک بڑے سے ٹکڑے کو انگلیوں سے دبا کر اُس نے منہ میں نچوڑا۔ اور اُبکائی لی۔ اس کے بعد وہ دونوں ٹکروں کو بغیر چبائے ہوئے نگل گیا۔

جب دوبارہ اُس کی آنکھ کھلی تو وہ وہیں بیچ پر پڑا ہوا تھا۔ کیکڑے کے چند ٹکڑے برابر میں پڑے تھے جو شاید اُلٹی سے واپس نکل آئے تھے۔ اُسی وقت اُس نے محسوس کیا کافی فاصلے پر ایک مکان میں روشنی ہو رہی ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنا مشکل تھا۔

اُس نے اپنے ماتھے کو چھو کر دیکھا لیکن باوجود اس کے کہ آنکھیں جل رہی تھیں، گرم ہاتھوں سے بخار کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ وہ سوچ رہا تھا ایسا تو نہیں ہے میرا دماغ جواب دیتا جا رہا ہے اور زبردست خواہش نے جہاں روشنی نہیں تھی وہاں روشنی کر دی ہے۔

تھوڑی دیر بعد، ایک سرد اُس مکان کے برآمدے میں آ کر کھڑا

کہاں ہیں، کوئی نلکا کیوں نہیں ہے۔ نالیاں کیوں نہیں ہیں، لوگوں نے کتنے کیوں نہیں پال رکھے ہیں اور خود لوگ کہاں ہیں؟ لیکن اس سے پہلے کہ میں بالکل نڈھال ہوجاؤں ایک کوشش کھانے اور پانی کے لئے اور کر ڈالنی چاہیے۔ باقی کل صبح دیکھا جائیگا۔

رات بسر کرلے کی جگہ کا تعین کرکے وہ واپس سمندر کی طرف چل پڑا۔ بادل اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے رسی تڑا کر بھاگے ہوں اور اس کے ہاتھ نہ آنے کا عہد کر چکے ہوں۔

کنارے کے پاس پہنچ کر وہ مونگے (ACORN BARNACLES) سے لسی ہوئی ایک خاردار چٹان پر بیٹھ گیا جس کے دو پاٹوں کے بیچ میں پانی ریلا کرکے آتا تھا اور جھاگ بن کر ہوا میں بکھر جاتا تھا۔ مدھم چاندنی میں پانی کے اُتر جانے کے بعد کے وقفوں میں اُسے پتھروں میں چھپے ہوئے کیکڑے دکھائی دینے لگے جو ہر بار پانی کی لہر کے آنے پر تھوڑے سے اوپر کو ہوجاتے تھے جیسے بھیگ جانے سے ڈر رہے ہوں۔

ادھر اُدھر ہاتھ دوڑانے پر بھی جب اُسے کوئی پتھر نہیں ملا تو وہ اپنی قمیص اُتارنے لگا جو پیٹھ پر چپک گئی تھی۔ قمیص اُتارنے میں اُس نے درد کی ایک سسکاری لی۔ کیونکہ پیٹھ اور بازو دونوں دھوپ سے جل چکے تھے۔ بعد میں چٹان پر لیٹ کر جب وہ ایک بڑے سے کیکڑے پر اپنی قمیص پھینک رہا تھا تو ایک لہر اس کے بازو کو بھگو گئی اور نمک لگنے پر اُسے احساس ہوا اُس کی کھال کتنی زخمی ہے۔ لیکن کیکڑا قمیص کے نیچے حرکت کر رہا تھا اور خطرہ تھا دوسری لہر کے آنے پر وہ کہیں اُسے جل نہ دے جائے۔

اُس نے پھرتی سے ریت پر کود کر اُسے اپنے پیر سے کچل ڈالا

اور تلووں کے نیچے اس کے خول (SHELL) کو چٹختا ہوا محسوس کیا —

تھوڑی دیر بعد قمیص کے نیچے کی حرکت رک گئی اور ہاتھ سے چھونے پر بھی کیکڑے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں نے جنبش نہیں کی۔ قمیص میں ان ٹکڑوں کو سمیٹ کر وہ خشک ریت پر جا کر بیٹھ گیا۔

شہر اُسی طرح گنگ تھا اور جو مل گیا تھا اس سے زیادہ کی توقع بیکار تھی۔ کرن ٹارن نے انگلیوں سے شیل میں بھرا ہوا ٹھنڈا گودا کھود کر نکالا اور اُسے ہونٹوں پر پھیر کر دیکھا۔ پھر ایک بڑے سے ٹکڑے کو انگلیوں سے دبا کر اُس نے منہ میں نچوڑا۔ اور اُبکائی لی۔ اس کے بعد وہ دونوں ٹکروں کو بغیر چبائے ہوئے نگل گیا۔

جب دوبارہ اُس کی آنکھ کھلی تو وہ وہیں بیچ پر پڑا ہوا تھا۔ کیکڑے کے چند ٹکڑے برابر میں پڑے تھے جو شاید اُلٹی سے واپس نکل آئے تھے۔ اُسی وقت اُس نے محسوس کیا کافی فاصلے پر ایک مکان میں روشنی ہو رہی ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنا مشکل تھا۔

اُس نے اپنے ماتھے کو چھو کر دیکھا لیکن باوجود اس کے کہ آنکھیں جل رہی تھیں، گرم ہاتھوں سے بخار کا اندازہ نہیں ہو سکا۔

وہ سوچ رہا تھا ایسا تو نہیں ہے میرا دماغ جواب دیتا جا رہا ہے اور زبردست خواہش نے جہاں روشنی نہیں تھی وہاں روشنی کر دی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک مرد اُس مکان کے برآمدے میں آ کر کھڑا

ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں شاید گلاس تھا جسے اُسنے دو ایک بار ہونٹوں سے لگایا۔ پھر اندر سے ایک لڑکی آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

کرن ٹارن نے ہنسنا چاہا: 'گلاس، گھر، روشنی، لڑکی۔۔ اس کے بعد شاید مجھے اُس برآمدے میں کھانے کی میز بچھی ہوئی نظر آئے گی'۔

'آخر یہاں ہو کیا رہا ہے؟ میرا خیال ہے سپاہی ہیں یا ان کی روحیں جو اس بھوتوں کے شہر میں رات کو لڑکیاں لے کر آئے ہوں گے۔ یعنی اُس زمانے میں جب یہاں پانی لایا جاتا ہوگا'۔

پھر بھی اس روشنی کو دیکھتے رہنے میں ایک طرح کا سکون تھا۔ کچھ دیر بعد پانچ مرد اور دو لڑکیاں اس مکان کے کمروں سے باہر نکل آئے۔ اُسنے سوچا 'اب واہمہ وہاں کھانے کی میز بچھانے والا ہے اور لوگ مجھے کھانا کھاتے ہوئے نظر آئیں گے'۔

لیکن فوراً ہی کمروں میں اندھیرا ہو گیا۔ وہ لوگ برآمدے کی سیڑھیوں سے ایک دوسرے کے کندھوں پر جھولتے ہوئے نیچے اُتر آئے اور پھر مکان کی پشت کی طرف چلے گئے۔ برآمدے کی بتی بھی بجھ گئی۔ اب ہر طرف دوبارہ اندھیرا تھا۔ لیکن تھوڑے وقفے کے بعد روشنی کی سیدھی سیدھی لکیریں ہوا میں بنیں جیسے کار کی ہیڈ لائٹس کسی نے کھولی ہوں۔

روشنی نزدیک ہونے لگی لیکن جلد ہی مکانوں کی پشت پر جا کر گھوم کر غائب ہو گئی۔

صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو سمندر شانت تھا۔ بیچ پر سیپیاں بکھری ہوئی تھیں اور یہ دیکھ کر اُسے تعجب ہوا کہ ریت

پر کہیں کہیں کسی بڑے جانور کی سوکھی ہوئی مینگنیاں بھی پڑی تھیں۔
'شاید کسی نہ کسی قسم کی زندگی یہاں موجود ہے'۔
اس خیال نے اُسے پھر انتظار کرنے کا حوصلہ دیا۔ دو مکانوں کے بیچ میں ایک بار اُسے شبہ ہوا کہ شاید ایک باداسی رنگ کا کتا کھڑا ہے۔ لیکن اسے بھی نظر کا دھوکا سمجھ کر اُسنے رد کردیا۔
قمیص بھیگی ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا رات سوتے میں تھوڑی بہت بوندا باندی ہوئی ہے۔ کرن ٹارن نے قمیص کے دامن کو پھلے ہونٹوں پر پھیرا اور پھر اُسے بے صبری سے چوسنے لگا۔ اسکا مزہ پانی جیسا تھا۔

شہر میں ابھی تک زندگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے۔ نہ ہی کسی گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ پھر بھی وہاں جانے میں کیا حرج تھا۔ یوں بھی دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور دن بہرحال اُسے کسی برآمدے یا گھر ہی میں گذارنا تھا۔
'کیوں نہ کسی فوجی کا مہمان ہوا جائے'؟ اُسنے خود کو ہنسانے کے لیے زیرلب کہا۔

مکانوں کے بیچ میں چھوٹی ہوئی جگہوں پر کہیں کہیں سفید ہڈیاں اور مینگنیاں پڑی تھیں۔ مکان مختلف ساخت کے تھے اور یقیناً کئی لحاظ سے فوجی بارکوں اور کوارٹروں سے مختلف تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ پورے شہر میں وائرلیس کا اینٹینا کہیں دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بعض مکان بے حد خوبصورت تھے جیسے چھوٹے چھوٹے بنگلے ہوں۔ ان کے برآمدے سمندر کے رخ پر کھلتے تھے۔ اکثر کی کنکریٹ کی سیڑھیاں جوار بھاٹوں کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہل گئی تھیں۔ کنارے پر ریت میں جہاں اس وقت لہریں ٹکرا رہی تھیں، کسی مکان کی تین طرف کی دیواریں

کھڑی رہ گئی تھیں۔ چوتھی طرف سے اس میں سمندر کی لہریں آ اور جا رہی تھیں۔

اوپر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک ٹوٹے ہوئے خوبصورت مکان کا سامنے کا حصہ ابھی تک کھڑا تھا اور دروازے میں جس کے پیچھے کا کمرہ کب کا منہدم ہو چکا تھا تالا جوں کا توں لگا ہوا معلوم نہیں کس چیز کی حفاظت کر رہا تھا۔ کرن ٹارن کمزور سی ہنسی ہنسا اور اُس مکان کو پیچھے سے دیکھنے کے لئے چل پڑا۔ لیکن اوپر پہنچنے کے بعد پتہ چلا برآمدے کی دیوار اور بند دروازوں کے پیچھے صرف ملبہ پڑا ہے اور کوئی چیز نہیں تھی۔ مکان کے برآمدے کے فرش کو جو شطرنج کی بساط کی طرح سرخ اور سیاہ خانوں میں بٹا ہوا تھا ایسا لگتا تھا کسی نے ہاتھ مار کر الٹ دیا ہے۔

نیچے تھوڑے فاصلے پر ایک خاردار مچھلی BURR FISH پتھروں پر پڑی تھی جسے سمندر اپنے پیچھے وہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بے وجہ وہاں تک گیا اور مچھلی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ مچھلی کا طوطے کی چونچ جیسا منہہ دھوپ میں تپ کر بے رنگ ہو چکا تھا اور خود مچھلی کو چیونٹیاں اُس سے پہلے ہی اندر سے خالی کر چکی تھیں۔

باوجود کوشش کے خود کو بچانا کرن ٹارن کے لیے دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن شکست تسلیم کرنے سے پہلے وہ دو عمارتوں تک اور جانا چاہتا تھا: ایک وہ جو سب سے بڑی تھی اور دوسری وہ جہاں اُسنے روشنی دیکھی تھی یا یہ کہ جہاں اُسے روشنی کا شبہ ہوا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ دونوں عمارتیں مختلف سمتوں میں تھیں۔ لیکن دھوپ ابھی اتنی تیز نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنی کوشش ترک کردیتا۔ چنانچہ وہ پہلے اُس بڑی عمارت کی طرف چل پڑا جو پچھم میں تھی۔

ایسا لگتا تھا یہ عمارت کسی زمانے میں ہوٹل تھی کیونکہ اُس کے ایک طرف کی ٹوٹی ہوئی دیوار پر تھوڑی سی محنت سے ہوٹل سیرینیڈ پڑھا جا سکتا تھا۔ کمرے بند تھے اور ریسیپشن ہال اگر کوئی تھا تو وہ بھی اندر سے بند تھا۔

پانی ملنے کی امید ختم ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک جگہ بیٹھے رہنے سے یہیں پتھروں پر سمندر کے کنارے پیاس سے سسک سسک کر دم توڑ دینے کا خوف اور بھی بڑھ جاتا تھا۔

کچھ دیر ہوٹل کی سیڑھیوں پر سستانے کے بعد وہ دوسری سمت میں چل پڑا جدھر وہ مکان تھا جس کے برآمدے میں اُسنے ایک آدمی کو گلاس سے کچھ پیتے ہوئے دیکھا تھا۔

لیکن یہاں پہنچ کر مایوسی جو کب کی مدھم پڑ چکی تھی ایکدم دوبارہ بھڑک اٹھی اور فوراً ہی جھلاہٹ میں بدل گئی۔ کیونکہ سیڑھیوں کے سامنے وھسکی کی خالی بوتل پڑی تھی اور برآمدے میں ٹوٹے ہوئے گلاسوں اور ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ کرن ٹارن نے بوتل اٹھا کر اُسے سونگھا۔ اس میں سے تازہ اسپرٹ کی بو آ رہی تھی۔ پھر بوتل اٹھا کر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ وہ بوتل سے شیشے توڑ کر اندر داخل ہونا چاہتا تھا جیسے اس کے واہمے کے کردار وہاں اندر چھپے بیٹھے تھے۔ اور

ان کے پاس پینے کا پانی تھا۔
لیکن دروازے اور کھڑکیاں مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ بوتل کے ٹوٹ جانے پر وہ بے دم ہوکر ٹھنڈے فرش پر گر پڑا۔

دن بھر کرن ٹارن بخار میں جلتا رہا۔ کبھی اُسے اپنا جہاز ڈوبتا ہوا نظر آتا تھا کبھی اپنے گھر والے۔ جہاز سے جان بچانے کے لیے کشتیاں رسیوں کے سہارے پانی میں اُتاری جا رہی تھیں۔ ملاح اور مسافر ہر کشتی کے پانی کی سطح تک پہنچتے ہی اس پر ہلا کرکے سوار ہونے کی کوشش کرتے تھے اور کشتی اُلٹ کر ان میں سے کتنوں ہی کو ڈھانپ لیتی تھی۔

کرن ٹارن کراہ رہا تھا۔ دو ایک بار اُس نے ڈوبنے سے بچنے کے لیے ٹھنڈے فرش پر ہاتھ پیر مارے۔

اُس نے ماسٹر (کپتان) کو جہاز کے برج (Bridge) پر کھڑا دیکھا۔ لوگ پانی میں کود رہے تھے۔ لیکن بجائے افسردہ اور پریشان دکھائی دینے کے ماسٹر ہنس رہا تھا۔ پھر وہ وہیں سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر تاش کے پتے لہروں پر بانٹنے لگا۔ لوگ اُن پتوں کو اٹھانے کے لیے ہاتھ پیر چلا رہے تھے۔ لیکن لہریں پتوں کو بہا کر دور لے جاتی تھیں۔

ہر چیز گھوم رہی تھی۔ خود کرن ٹارن کے کیبن (Cabin) کا سامان گھوم رہا تھا۔ ایش ٹرے، بیوی کی تصویر، قمیص، کتابیں، اور لانگ پلے ریکارڈز —

آرام کے لمحے صرف وہ تھے جب اُس کی آنکھ جھپک جاتی تھی۔

شام کو جیسے پورا شہر ایک دم جاگ اٹھا ہو۔ رات جس جگہ سے اس نے کار کی روشنی کو غائب ہوتے دیکھا تھا وہاں

اب کتنی ہی کاریں ایک دوسرے کے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔ ہر پیچھے والی کار اپنے آگے کی کار کی اڑائی ہوئی ریت کے ذرات کو جگمگا دیتی تھی۔ دور ریتیلے میدان میں سے پہاڑیوں کے پیچھے سے کاریں ایک کے بعد ایک چلی آ رہی تھیں۔

اُسے تعجب تھا اپنی بھوک میں، دن کی روشنی میں یہ راستہ اُسے نظر ہی نہیں آیا تھا! غالباً وہ کسی جزیرے پر تھا جس کے پیچھے ایک لیگون تھی جس میں اس وقت دو ایک موٹر بوٹس بھی چل رہی تھیں۔ دن میں اس نے لیگون کے کنارے کشتی رکنے کا 'کے' (پلیٹ فارم) بھی دیکھا تھا لیکن اس وقت وہاں کوئی کشتی نہیں تھی۔ اُسے تعجب تھا یہ سب کیسے اور کس وقت ہوا؟ دور لیگون کے بہت پیچھے کسی قسم کے تاڑ کے درخت تھے۔ ہوسکتا ہے ناریل ہوں، ہو سکتا ہے کھجور۔ جن کے نیچے جھونپڑیوں کے مدھم خطوط تھے۔ اور جھونپڑیوں کی چھتوں سے سفید دھواں ٹھہری ہوئی ہوا میں سیدھا اوپر کو اُٹھ رہا تھا۔

بیچ کے اکثر مکانوں میں اب روشنی ہوگئی تھی۔ کھڑکیاں کھلتی جا رہی تھیں جن میں پردے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ بہت سے برآمدوں میں عورتیں اور بچے نظر آ رہے تھے—

وہ غفلت اور ہوش کے بیچ میں غوطے کھا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اُسے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔
کچھ بچے اونٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" وہ چلایا— "یہاں اونٹ پائے جاتے ہیں"
کسی نے کہا "خاموش رہو"
"اور آدمی بھی پائے جاتے ہیں" کرن ٹارن نے کمزور سی ہنسی

سے کہا۔

"وکس ملک کا لگتا ہے؟" ایک اچھی شکل والی سانولی لڑکی نے اپنے برابر کھڑے ہوئے سرد سے پوچھا۔

کرن ٹارن اپنے بارے میں اُس کا جواب نہیں سن پایا لیکن اسے اپنا سر جھولتا ہوا محسوس ہوا جیسے اُسے ہوا میں اٹھایا جا رہا ہو —

"لٹال دو" کسی نے کہا۔

کرن ٹارن نے بھی وہی بات اُسی لہجے میں دہرا دی "لٹال دو" سب ہنس پڑے۔

"بوب کال دی ڈاکٹر" ایک آواز آئی۔

وہ ٹھیک سے سوچ نہیں پا رہا تھا کہ گھر میں اپنے بستر پر ہے یا جہاز میں اپنی برتھ پر —

کسی نے اُسے آہستہ آہستہ چمچے سے کچھ پلانا شروع کیا۔ وہ بڑ بڑایا —

"پانی۔ پانی —"

لوگ اس کے ہونٹوں پر برف پھیرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں اُسے گہری نیند آگئی —

صبح جب کرن ٹارن کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کے باہر سمندر گرج گرج کر کنارے سے ٹکرا رہا تھا۔ جہاں پچھلی دو راتوں میں زندگی کا نام و نشان تک نہیں تھا وہاں اس وقت ہر قسم کی ہما ہمی تھی۔ لڑکیاں غباروں کی طرح پھولے ہوئے پاجاموں اور قمیصوں میں بھی سمندر میں نہا رہی تھیں اور بکینیز میں بھی۔ بکینیز میں نہانے والی عورتوں کی رنگت گوری تھی۔

ں نے چاروں طرف گردن گھما کر دیکھا اور ہر طرف اُسے زندگی ظر آئی۔ بچے ریت پر مکان اور گلی کوچے بنا رہے تھے۔ ایک ئیس کریم والا بھیگی ہوئی ریت میں اپنی بوجھ سے لدی ہوئی ئیسکل کو دھکا دے کر لے جا رہا تھا۔ لڑکیاں اونٹوں پر بیٹھی ھیں جنہیں نیگرو لڑکے ریت پر دوڑا رہے تھے۔ مووی کیمرے، ٹل کیمرے، پیراسولز، کھجور کے پتوں کے ہیٹ اوڑھے ہوئے ڑکیاں، کتے، سمندر پر اُڑنے والی چڑیاں اور سرفنگ کرتے ہوئے ورے نوجوان لڑکے۔

ہر برآمدے میں سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ھڑکی کے ایک کونے میں سے اُسے کسی کی پیٹھ دکھائی دی جس ر لمبے سنہری بال بکھرے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب کرز ٹارن نے اُس سر کو گھومتے دیکھا تو اُسے قدرے مایوسی وئی کیونکہ بیئر کا گلاس ہاتھ میں تھامے اور دھوپ کا چشمہ گائے غالباً وہ کوئی امریکی نوجوان تھا۔

شاید انہی لوگوں نے مجھے یہاں لا کر لٹایا ہے،۔

ستے سرہانے کی طرف کی کھڑکی سے باہر نظریں دوڑائیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہوٹل سیرینیڈ کے صحن میں بڑی بڑی رنگین چھتریاں ظر آ رہی تھیں جن کے سائے میں لوگ سوئیمنگ کاسٹیوم پہنے بیٹھے ہوئے بیئر پی رہے تھے۔

بائیں ہاتھ کی کھڑکی سے ایک خاموش مکان نظر آ رہا تھا جس کے دروازے ابھی تک بند تھے۔

لیگون کی طرف سے ریت پر اس نے ایک نوجوان اور اس کی ہم عمر ساتھی کو آتے دیکھا۔ دونوں خوش نظر آ رہے تھے۔ لڑکی

کے کپڑے نئے اور شوخ رنگوں کے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تھیلے اور پانی کی بوتلیں تھیں۔ کرن ٹارن نے بے وجہ فیصلہ کرلیا 'دونوں اسی ملک کے رہنے والے ہیں۔ کیونکہ دونوں کی رنگت گندمی ہے۔ لیکن اس خاموش شہر کے رہنے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ ہاتھ میں پانی کی بوتلیں لے کر آ رہے ہیں'۔

برآمدے میں پہنچ کر لڑکے نے جیب سے رومال نکال کر لڑکی کے لیے فرش جھاڑنا چاہا۔ لیکن لڑکی نے اس کے ہاتھ سے رومال لے لیا اور خود فرش جھاڑنے لگی۔

ایک بار پھر کرن ٹارن نے بے وجہ فیصلہ کرلیا 'دونوں کی شادی ابھی حال ہی میں ہوئی ہے'— اور اُسے ایک طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔

"ہے۔ ہاؤ آر یو؟"— کسی نے کہا۔

کرن ٹارن چونک پڑا۔

وہ لوگ برآمدے سے اندر آ گئے۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ" ایک گوری لڑکی نے کہا۔

باہر برآمدے کی ریلنگ کو پکڑ کر ایک نوجوان برابر کے مکان سے مخاطب ہوکر چلایا

"ہائے ڈوک! مریض جاگ گیا ہے"۔

اپنا اپنا تعارف کرانے کے بعد وہ لوگ کرسیاں، اسٹول، اور کارڈ ٹیبل گھسیٹ کر اُس کے تینوں طرف بیٹھ گئے۔

ایک لحیم شحیم شخص جس کے بارے میں بعد میں کرن ٹارن کو پتہ چلا۔ یہاں کا کوئی مشہور سرجن ہے سوئمنگ ٹرنکس پر گاؤن

پہنے ہوئے ننگے پیر کمرے میں داخل ہوا اور اس کا سرسری طور سے معائنہ کرنے لگا۔

"یو ڈڈ اے فائین جوب ڈوک" امریکن نے کہا۔

سرجن مسکرایا اور کرن ٹارن سے بولا "تمھارا جہاز ڈوب گیا ہے؟"

کرن ٹارن نے 'ہاں' میں سر ہلایا۔

"شپنگ ایجنٹس کون ہیں؟"

"سوڈویل"۔ کرن ٹارن نے جواب دیا۔

"زمین کے اس ٹکڑے پر کبھی پہلے جناب کا گذر ہوا ہے؟"

"نوپ" کرن ٹارن نے بھی مسخرے پن سے کہا۔

"معلوم ہے شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

کرن ٹارن نے 'نہ' میں سر ہلایا۔

"۱۸ میل"۔

کرن ٹارن نے سیٹی سی بجائی "اٹھارا میل!"

کچھ دیر سوچ کر سرجن نے کہا "آج کون سا دن ہے معلوم ہے؟"

کرن ٹارن نے پھر 'نہیں' میں سر ہلایا۔

"یہاں آئے کتنے دن ہوئے؟"

"۲ راتیں"۔

سب ہنس پڑے۔ کرن ٹارن بھی ہنس پڑا۔

"ڈیڈ!" برآمدے کے نیچے سے سوئیمنگ ڈریس پہنے ہوئے ایک یوریشین آٹھ دس سال کی بچی نے آواز دی۔

"کمنگ" سرجن نے کہا۔

باہر جاتے ہوئے اسنے کرن ٹارن سے کہا "کل تک باقی کام ان

لوگوں پر چھوڑ دو''۔

کرن ٹارن نے اُسے سمندر کی طرف جاتے دیکھا جہاں ایک یوروپین عورت کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

'اس کی بیوی ہوگی اور کون ہو سکتی ہے'، کرن ٹارن نے دل میں فیصلہ کر لیا، اور ریت پر بھاگتی ہوئی بچی کو دیکھ کر اسے گویا اسکا ثبوت مل گیا۔

اس کے جانے کے بعد ایک دم لیگون کے پاس والے مکان سے کسی کے غصے سے بولنے کی آواز سنائی دی۔

کرن ٹارن نے دیکھا پگڑی، جیکٹ اور ہوا بھرے ہوئے پاجامے میں ملبوس ایک پٹھان اس لڑکی اور نوجوان پر چلا رہا تھا اور ہاتھ کے اشاروں سے باہر نکل جانے کو کہہ رہا تھا۔

''اس گھر کا چوکیدار ہے''، کسی نے کرن ٹارن کو بتایا۔

نوجوان کے چہرے پر خفت کے آثار تھے جیسے اُسے کسی نے بغیر ٹکٹ کے ٹرین میں سفر کرتے پکڑ لیا ہو۔ وہ دونوں اپنا سامان سمیٹ کر مکان کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئے۔

نوجوان کا چہرہ اترا ہوا تھا جیسے اُسے اپنی بے عزتی ہونے پر غصہ بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ساتھی کو دھوپ میں لیے لیے پھرنے کا افسوس بھی۔ کیونکہ باہر سایا بس کہیں کہیں ہی تھا اور سورج بار بار بادلوں سے بے نقاب ہوجاتا تھا۔

لڑکی نوجوان کو خوش کرنے کے لیے زبردستی مسکرا رہی تھی۔ بیچ کی طرف جاتے ہوئے اس نے نوجوان کے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا۔

''میرا خیال ہے نوجوان کے اعصاب اب کہیں جا کے ڈھیلے ہوئے

ہوں گے" کرن ٹارن نے کہا۔
اس کے ساتھی ہنس پڑے۔
"میرے ساتھ بھی حادثہ اگر شادی کے پہلے ہفتے یا مہینے میں ہوا ہوتا تو میں یقیناً لڑ پڑتا"
ایک گوری سی لڑکی نے کہا "کیوں؟"
"کیونکہ شادی کے شروع کے دنوں میں شوہر اور بیوی دونوں کی اپنی علحدہ علحدہ شخصیت ہوتی ہے اور علحدہ علحدہ اپنی بے عزتی کا احساس، جسے دونوں ایک دوسرے سے چھپاتے ہیں"۔
"آپ شادی شدہ ہیں؟" اس کے ساتھیوں نے پوچھا۔
کرن ٹارن نے 'ہاں' میں سر ہلایا "اور بچے بھی ہیں"۔
"ہمیں انہیں کیبل کر دینا چاہیے" سب نے کہا۔
اس کے نئے ساتھی اس کے کھانے سونے اور جہاز کے ایجنٹ کے پاس لے جانے پر گفتگو کرنے لگے اور ایسا لگتا تھا ان لوگوں کے پاس نہ صرف کافی فالتو وقت اور فالتو پیسہ تھا بلکہ ادھر اُدھر لٹانے کے لیے فالتو جذبات بھی تھے۔
امریکن کا تعلق ہیس کور سے تھا، اس کا نام پال گرفتھ تھا۔ ڈچ لڑکی اُولاویلڈ کیمپ اور انگریز نوجوان ڈیوھنٹن بے وجہ ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہلکے گورے رنگ والی لڑکی شملا تھی جو ہندو بھی ہو سکتی تھی اور عیسائی بھی۔ لیکن ہندو تھی۔
سب گندمی رنگت والی لڑکی سائرہ کے — جسے وہ سیرہ کہتے تھے — مہمان تھے۔ سائرہ خود اس بنگلہ نما مکان کی مالک نہیں تھی لیکن کسی واقفیت کی بنا پر یہ مکان اُسے دو راتوں کے لئے مل گیا تھا جو یہاں کا عام رواج تھا۔

اسنے نوجوان اور اُس کی بیوی کو دھوپ میں ریت پر اُس جگہ جا کر بیٹھتے دیکھا، جہاں تک اس وقت لہریں اپنا جھاگ چھوڑ کر واپس جا رہی تھیں۔ لڑکی نے تھرماس سے کچھ انڈیل کر نوجوان کو دیا جس کے بارے میں کرن ٹارن نے فیصلہ کرلیا کہ کافی یا چائے تھی کیونکہ وہ اُسے آہستہ آہستہ ہی پیا تھا۔

اُدھر سے نظریں ہٹا کر کرن ٹارن نے ایکا ایکی سوال کیا "یہ شہر کوئی گوسٹ ٹاؤن (بھوتوں کا شہر) ہے یا ۱۸ میل دور والے اُس بڑے شہر کی کوئی نواحی بستی؟ کوئی خاص قسم کا سبرب؟"

"تم لوگ سچ مچ کے ہو؟"

"ہم لوگ تمہیں بھوت نظر آ رہے ہیں؟!" سیرہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے ابھی تک تمہارا دماغ ٹھیک سے نہیں کھلا ہے" ڈھونھٹن نے کہا۔

"وہ کیسے؟" کرن ٹارن نے پوچھا۔

"ارے بھائی نہ یہ گوسٹ ٹاؤن ہے نہ سبرب، اس کی اپنی حیثیت ہے، اپنا نام۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اور اور شہروں میں بس اتنا فرق ہے کہ وہاں لوگ مستقل طور سے رہتے ہیں اور یہاں وقتاً فوقتاً"۔

کچھ دیر خاموشی رہی

"اور اتنی بڑی بستی یا ویرانہ انہوں نے محض اس میں وقتاً فوقتاً رہنے کے لیے تعمیر کیا ہے؟!"

"That's right" کئی ایک نے ایک ساتھ کہا

"This must be a very affluent society"

(میرا خیال ہے یہ بہت مالدار ملک ہوگا)

"بہت مالدار" سب نے ایک ساتھ کہا "یہاں کی ہر جا پر ہن برستا ہے"

"کافی تیار ہے" ایک سانولی نوجوان عورت نے اندر کے دروازے سے سر باہر نکال کر اعلان کیا۔

"تھینک یو میگی" سب نے کہا۔

کرن ٹارن نے بھی تھینک یو کہا اور انکے ساتھ اٹھنے پر آمادہ ہوگیا۔ اُس نے پلنگ کے نیچے عادتاً نظریں دوڑائیں جہاں اسکی سلیپریں ہونی چاہیے تھیں۔ لیکن نہیں تھیں۔

"ہم سب ننگے پیر ہیں" پال گرفتھ نے کہا "اور ہمیں معلوم ہے تم بغیر جوتوں کے بھی تیر سکتے ہو، اسی لیے انہیں جہاز پر چھوڑ کر آئے تھے"۔

"جہاں آپ تیرنے کے لیے سمندر میں اُترے تھے وہاں پانی ٹھنڈا تھا یا گرم؟" میرہ نے مسخرے پن سے پوچھا۔

"نیم گرم" کرن ٹارن نے کافی پیتے ہوئے کہا۔ "نہانے کے لیے بالکل درست"۔

باہر دھوپ تیز ہو چکی تھی اور سمندر کی سطح پر نظریں جمانا مشکل تھا۔ ریت پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے سر پر اُسکے ساتھی نے نیلے پلاسٹک کے بیگ سے سایہ کر رکھا تھا۔ وہ دونوں سی گلز کو لہروں پر منڈلاتا دیکھ رہے تھے۔ دونوں سمندر سے پوری طرح مسحور تھے۔

کافی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کرن ٹارن نے گمبھیر لہجے میں

اسنے نوجوان اور اُس کی بیوی کو دھوپ میں ریت پر اُس جگہ جا کر بیٹھتے دیکھا، جہاں تک اس وقت لہریں اپنا جھاگ چھوڑ کر واپس جا رہی تھیں۔ لڑکی نے تھرماس سے کچھ انڈیل کر نوجوان کو دیا جس کے بارے میں کرن ٹارن نے فیصلہ کرلیا کہ کافی یا چائے تھی کیونکہ وہ اُسے آہستہ آہستہ پی رہا تھا۔

اُدھر سے نظریں ہٹا کر کرن ٹارن نے ایکا ایکی سوال کیا ''یہ شہر کوئی گوسٹ ٹاؤن (بھوتوں کا شہر) ہے یا ۱۸ میل دور والے اُس بڑے شہر کی کوئی نواحی بستی؟ کوئی خاص قسم کا سبرب؟''

''تم لوگ سچ مچ کے ہو؟''

''ہم لوگ تمہیں بھوت نظر آ رہے ہیں؟!'' سیرہ نے کہا۔

''میرا خیال ہے ابھی تک تمہارا دماغ ٹھیک سے نہیں کھلا ہے'' ڈھوہنٹن نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' کرن ٹارن نے پوچھا۔

''ارے بھائی نہ یہ گوسٹ ٹاؤن ہے نہ سبرب، اس کی اپنی حیثیت ہے، اپنا نام۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اور اور شہروں میں بس اتنا فرق ہے کہ وہاں لوگ مستقل طور سے رہتے ہیں اور یہاں وقتاً فوقتاً''۔

کچھ دیر خاموشی رہی

''اور اتنی بڑی بستی یا ویرانہ انہوں نے محض اس میں وقتاً فوقتاً رہنے کے لیے تعمیر کیا ہے؟!''

"That's right" کئی ایک نے ایک ساتھ کہا

"This must be a very affluent society"

(میرا خیال ہے یہ بہت مالدار ملک ہوگا)

"بہت مالدار" سب نے ایک ساتھ کہا "یہاں کی ہر جا پر ہن برستا ہے"

"کافی تیار ہے" ایک سانولی نوجوان عورت نے اندر کے دروازے سے سر باہر نکال کر اعلان کیا۔

"تھینک یو میگی" سب نے کہا۔

کرن ٹارن نے بھی تھینک یو کہا اور انکے ساتھ اٹھنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے پلنگ کے نیچے عادتاً نظریں دوڑائیں جہاں اسکی سلیپریں ہونی چاہیے تھیں۔ لیکن نہیں تھیں۔

"ہم سب ننگے پیر ہیں" پال گرلتھ نے کہا "اور ہمیں معلوم ہے تم بغیر جوتوں کے بھی تیر سکتے ہو، اسی لیے انہیں جہاز پر چھوڑ کر آئے تھے"۔

"جہاں آپ تیرنے کے لیے سمندر میں اترے تھے وہاں پانی ٹھنڈا تھا یا گرم؟" میرہ نے مسخرے پن سے پوچھا۔

"نیم گرم" کرن ٹارن نے کافی پیتے ہوئے کہا۔ "نہانے کے لیے بالکل درست"۔

باہر دھوپ تیز ہو چکی تھی اور سمندر کی سطح پر نظریں جمانا مشکل تھا۔ ریت پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے سر پر اسکے ساتھی نے نیلے پلاسٹک کے بیگ سے سایہ کر رکھا تھا۔ وہ دونوں سی گلز کو لہروں پر منڈلاتا دیکھ رہے تھے۔ دونوں سمندر سے پوری طرح مسحور تھے۔

کافی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کرن ٹارن نے گمبھیر لہجے میں

کہا "میرا بھی یہی خیال ہے ۱۸ میل دور والے جس شہر کا آپ لوگ ذکر کر رہے ہیں وہاں واقعی دولت برستی ہوگی کیونکہ وہاں کے لوگ یہاں آکر رات دو رات رہتے ہیں اور واپس اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں"۔

"اپنے گھروں کو!؟ تو جناب کا خیال ہے یہ اُنکے گھر نہیں ہیں!؟" کسی نے کہا۔

"ان گھروں کے مالکوں کے یہاں کے شہر میں بھی گھر ہیں اور اکثر کے پہاڑی مقامات پر بھی ہیں جن میں وہ گرمیوں میں رہتے ہیں" حیسن (حسن) نے کہا

"اور سردیوں میں اُن میں کون رہتا ہے؟"

"سردیوں میں وہ بھی گوسٹ ٹاؤن بن جاتے ہوں گے" ہال گرلتھ بولا

"اور اُن گھروں کو کیا کہتے ہیں؟" کرن ٹارن نے بے وجہ پوچھا۔

"گرمیوں کے گھر"

"اور یہ ویک اینڈ کے گھر ہیں" اولاویلڈ کیمپ نے کہا۔

"That's a fine arrangement" کرن ٹارن نے کہا "سردیوں کے گھر، گرمیوں کے گھر، ویک اینڈ کے گھر"

"This is a bloody Sunday-town—" ڈیوہنٹن بولا۔ وہ غالباً لندن کا رہنے والا تھا۔

"ایک بات اور ہے" سیرہ نے کہا "جن کے یہاں گھر نہیں ہیں ان میں سے اکثر کے وہاں بھی گھر نہیں ہیں"

"مثلاً یہ نیگرو بڈھا جو اونٹ کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے ایک جھونپڑی میں رہتا ہوگا جسکی زمین کسی دوسرے کی ہوگی"

"ہمارے یہاں برابری ہے" حیسن (حسن) نے کہا۔

"شیور، شیور" سب اُس کی طرف پلٹ پڑے۔
"ہم کہتے ہیں مسجد میں بادشاہ اور غلام ایک ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے شہر میں اسکائی اسکریپرز اور کچے مکان بھی ساتھ ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں"۔
"ہیر، ہیر" ڈیوھنٹن نے کہا۔
"ہوں اُوں" کرن ٹارن مسکرایا۔
"یہاں کوئی نل نہیں ہے؟" تھوڑے وقفے کے بعد کرن ٹارن نے پوچھا
"آپ نہانا چاہتے ہیں؟" میگی نے پوچھا۔
"نہیں" اُس نے میگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرا مطلب پبلک واٹر ٹیپس سے ہے۔ بیچ پر آنے والوں میں سے اگر کسی کو پینے کے پانی کی ضرورت پڑجائے یا کوئی نہانا چاہے؟"
"میرا خیال ہے ایسے لوگ یہاں مشکل ہی سے پہنچ پاتے ہونگے جن کی اپنی ہٹ نہ ہو" اُولا بولی۔
"یہ بنگلے یہاں ہٹ (جھونپڑے) کہلاتے ہیں اور برابر ٹوٹتے بنتے رہتے ہیں" میگی نے وضاحت کی
"اور چھٹی کے دن کے علاوہ بھی اور بہت سے کاموں میں آتے ہیں" کسی نے معنی خیز انداز سے کہا۔
"مثلاً؟"
"مثلاً یہ کہ یہاں کسی بھی رات کو کسی ایسے آدمی کی خاطر مدارات کی جا سکتی ہے جس کی.." حسن بولتے بولتے رک گیا۔

"... جس کی آپ خاطر مدارات کرنا چاہتے ہوں" ہال گرلتھ نے جملہ مکمل کیا۔

"مجھے معلوم ہے" کرن ٹارن نے کہا

"دو ہی راتوں میں!"

"دو ہی راتوں میں" کرن ٹارن نے کہا "پانچ مرد، دو لڑکیاں، وھسکی اور ٹوٹی ہوئی چوڑیاں"۔

انھوں نے کرن ٹارن کے نظر کے دھوکے کو بڑی دلچسپی سے سنا، پھر کوئی بولا

"صرف چوکیدار کو پہلے سے بتلانا ہوتا ہے اور وہ رات کے ۲ بجے بھی لالٹین لئے آ جاتا ہے"۔

"He is an obliging person"

"That's a fine arrangement" کرن ٹارن نے پھر کہا۔

کاریں لیگون کے پاس سے گذرنے والی ریتیلی سڑک پر برابر آ اور جا رہی تھیں۔ کوئی دوسرا چوکیدار اُسی لباس اور اُسی زبان میں برابر کے گھر سے چلانے لگا۔

"کسی اور کو بر آمدے سے اٹھایا جا رہا ہے؟"

لوگوں نے اثبات میں سر ہلایا، حسین، سیرہ اور سیگی (حسن، سائرہ اور ماجدہ) جز بز نظر آ رہے تھے۔

ڈیوہنٹن نے انھیں برآمدے میں چلنے کے لیئے کہا جہاں وہ پہلے برج کھیل رہے تھے۔ اس میں موقع کی نزاکت کا لحاظ بھی شامل تھا،

اُولاً، سیرہ اور سیگی سامنے والے کمرے میں کھسر پھسر کرنے لگیں، الگے برابر میں زمین پر رکھا ہوا ریکارڈ پلیر زور سے بج رہا تھا،

کل اور آج میں کتنا فرق تھا آج جہاں بیچ پر ہر طرف زندگی کے پھول کھلے ہوئے تھے وہاں کل سوائے ریت اور جھاگ کے کیا تھا۔ آج سمندر بھی جو دو دن پہلے ایسا لگتا تھا اسکی جان کا لاگو ہو کرن ٹارن کو اچھا لگ رہا تھا۔

دوسری طرف نظر دوڑائی پر برآمدے کے پار اُس نے اُسی نوجوان اور لڑکی کو کندھے سے کندھا ملائے دھوپ میں واپس آتے دیکھا۔ دونوں نے تھیلوں سے اپنے اوپر اوٹ کرلی تھی اور انکے چہرے دھوپ سے تمتمائے ہوئے لگتے تھے۔ کرن ٹارن کا دل بجھ گیا۔

دونوں اُس سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ 'میرا خیال ہے کیا سایا ڈھونڈ رہے ہیں'۔ لیکن بادل بھاگ چکے تھے اور آسمان دھلی ہوئی چادر کی طرح صاف تھا۔ 'شاید شادی کے بعد دونوں کی پہلی آؤٹنگ ہے'۔ اُسے ان پر ترس آ رہا تھا۔

'اِس جگہ کا انھوں نے کیوں انتخاب کیا! اچھا ہے واپس جا رہے ہیں ورنہ ایک بار اگر بوتل کا پانی ختم ہو گیا تو کہاں سے آئے گا؟'

دونوں کئی ایسے بند مکانوں کے پاس سے گذرے جن میں ابھی تک تالا لگا تھا اور جن کے برآمدوں میں ٹھنڈا سایا بھی تھا اور ہر بار کرن ٹارن نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا اب وہ کہیں ٹک جائیں گے۔ لیکن جب وہ آخری مکان کے پاس سے بھی بغیر رکے ہوئے گذر گئے تو کرن ٹارن نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اُسے ان دونوں پر فخر محسوس ہوا—

تھوڑی دیر بعد انھوں نے کرن ٹارن کی نظروں کا ساتھ چھوڑ دیا۔

کافی کے بعد دوبارہ کرن ٹارن سے لیٹ جانے کو کہا گیا

"... جس کی آپ خاطر مدارات کرنا چاہتے ہوں" ہال گرلتھ لے جملہ مکمل کیا۔

"مجھے معلوم ہے" کرن ٹارن نے کہا

"دو ہی راتوں میں!"

"دو ہی راتوں میں" کرن ٹارن نے کہا "پانچ مرد، دو لڑکیاں، وھسکی اور ٹوٹی ہوئی چوڑیاں"۔

انھوں نے کرن ٹارن کے نظر کے دھوکے کو بڑی دلچسپی سے سنا۔ پھر کوئی بولا

"صرف چوکیدار کو پہلے سے بتلانا ہوتا ہے اور وہ رات کے ۲ بجے بھی لالٹین لیئے آ جاتا ہے"۔

"He is an obliging person"

"That's a fine arrangement" کرن ٹارن نے پھر کہا۔

کاریں لیگون کے پاس سے گذرنے والی ریتیلی سڑک پر برابر آ اور جا رہی تھیں۔ کوئی دوسرا چوکیدار اُسی لباس اور اُسی زبان میں برابر کے گھر سے چلانے لگا۔

"کسی اور کو برآمدے سے اٹھایا جا رہا ہے؟"

لوگوں نے اثبات میں سر ہلایا، حیسن، سیرہ اور میگی (حسن، سائیرہ اور ماجدہ) جز بز نظر آ رہے تھے۔

ڈیوہنٹن نے انھیں برآمدے میں چلنے کے لیئے کہا جہاں وہ پہلے برج کھیل رہے تھے۔ اس میں موقع کی نزاکت کا لحاظ بھی شامل تھا۔

اُولا، سیرہ اور میگی سامنے والے کمرے میں کھسر پسر کرنے لگیں۔ انکے برابر میں زمین پر رکھا ہوا ریکارڈ پلیر زور سے بج رہا تھا۔

کل اور آج میں کتنا فرق تھا آج جہاں بیچ پر ہر طرف زندگی کے پھول کھلے ہوئے تھے وہاں کل سوائے ریت اور جھاگ کے کیا تھا۔ آج سمندر بھی جو دو دن پہلے ایسا لگتا تھا اسکی جان کا لاگو ہو کرن ٹارن کو اچھا لگ رہا تھا۔

دوسری طرف نظر دوڑائی پر برآمدے کے پار اُس نے اُسی نوجوان اور لڑکی کو کندھے سے کندھا ملائے دھوپ میں واپس آتے دیکھا۔ دونوں نے تھیلوں سے اپنے اوپر اوٹ کرلی تھی اور انکے چہرے دھوپ سے تمتمائے ہوئے لگتے تھے۔ کرن ٹارن کا دل بجھ گیا۔

دونوں اُس سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ 'میرا خیال ہے کیا سایا ڈھونڈ رہے ہیں'۔ لیکن بادل بھاگ چکے تھے اور آسمان دھلی ہوئی چادر کی طرح صاف تھا۔ 'شاید شادی کے بعد دونوں کی پہلی آؤٹنگ ہے'۔ اُسے ان پر ترس آ رہا تھا۔

'اس جگہ کا انھوں نے کیوں انتخاب کیا! اچھا ہے واپس جا رہے ہیں ورنہ ایک بار اگر بوتل کا پانی ختم ہو گیا تو کہاں سے آئے گا؟'

دونوں کئی ایسے بند مکانوں کے پاس سے گذرے جن میں ابھی تک تالا لگا تھا اور جن کے برآمدوں میں ٹھنڈا سایا بھی تھا اور ہر بار کرن ٹارن نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا اب وہ کہیں ٹک جائیں گے۔ لیکن جب وہ آخری مکان کے پاس سے بھی بغیر رکے ہوئے گذر گئے تو کرن ٹارن نے ٹھنڈا سانس لیا۔ اُسے ان دونوں پر فخر محسوس ہوا—

تھوڑی دیر بعد انھوں نے کرن ٹارن کی نظروں کا ساتھ چھوڑ دیا۔

کافی کے بعد دوبارہ کرن ٹارن سے لیٹ جانے کو کہا گیا

حالانکہ وہ چل پھر کر اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ جو دن اُسنے تنہا لہروں پر کاٹے تھے ان میں وہ زندگی سے دور رہا تھا۔ اسنے اپنے سر پر سی گلز کو پر پھڑپھڑاتے دیکھا اور سنا تھا، ایک بار جب زندگی کی آس ختم ہوتی جا رہی تھی تو اسنے ڈولفنوں کو اپنے چاروں طرف ہوا میں اُچھلتے دیکھا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے تنہائی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ لیکن بیچ پر پھیلی ہوئی زندگی دوسری قسم کی تھی، بچے اور عورتیں، کھیل، بے فکری، لہروں پر پھینکی جانے والی رنگ برنگی بڑی گیندیں، پیرا سولز اور رنگین کپڑے —

برآمدے کے سامنے سے اُسے سرجن جاتا ہوا نظر آیا۔ کرن ٹارن کو چاروں طرف گردن گھماتے دیکھ کر ساجدہ اُسکے لیے بن او کھولرز لے آئی۔ کرن ٹارن نے ”تھینک یو میگی“ کہہ کر سب سے پہلے اُسے ہی فوکس کرنا شروع کردیا۔

ساجدہ اُس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے خاندان کے بارے میں پوچھنے لگی۔ کرن ٹارن نے جاگتی ہوئی نئی دلچسپی سے اپنے بیوی بچوں کا حال سنانا شروع کیا۔ لیکن جب عادتاً تصویر دکھانے کے لئے ہاتھوں نے جیب کی طرف جانا چاہا تو وہ اُداس ہوگیا۔

وہ تمام کپڑے، تصویریں، سوغاتیں جو اُسنے پچھلے چھہ ماہ میں گھر لے جانے کے لئے جمع کی تھیں، سمندر انھیں نگل گیا تھا اور اب وہ اُسی جہاز میں اس کے کیبن میں بند سمندر کی تھاہ میں کہیں پڑی ہوں گی۔

باہر حسن کے کسی سے بولنے کی آواز آئی۔ جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ برج کھیلنے والے خاموش ہوگئے اور پھر سب کے سب نئے آنے والوں کو ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ کرن ٹارن

کو ان آنے والوں کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی کیونکہ وہ یونی فارم میں تھے اور دنیا بھر کے گورنمنٹ آفیسرز تقریباً ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔

کرن ٹارن اٹھ کر بیٹھ گیا اور پارٹی کے چیف کے سوالوں کا جواب دینے لگا۔

ڈیوھنٹن نے گفتگو کو مختصر کرنے کے لیے بیئر کا ایک گلاس انسپکٹر کو لا کر دیا، باہر کی گرمی کے بعد ٹھنڈی بیئر کے گلاس پر جمی ہوئی پانی کی بوندیں — ایسی پیش کش کو ٹھکرانا انسپکٹر کے بس کی بات نہیں تھی۔ پارٹی کے باقی افراد ادھر اُدھر بیٹھ گئے اور ان میں سے ایک کرن ٹارن کے بیان کو کھردرے، مٹیالے کاغذ پر کاپئینگ پنسل سے لکھنے لگا جسکی نوک کو وہ بیئر کے گلاس کے باہر کی نمی سے کبھی کبھی تر کر لیتا تھا۔ باقی سمندر کی ٹھنڈی ہوا کو محسوس کر رہے تھے اور جلد ہی اونگھنے لگے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد کرن ٹارن نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ ماجدہ، شیلا، سیرہ اور اُولا سونے کے لیے کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں اور ڈیو، پال اور حسن باہر برآمدے میں بیٹھے بن اوکیولرز سے کھلے سمندر میں دور لنگرانداز جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔

"Say: seaman you need do?"

(''میں کہہ رہا ہوں ملاح تمھیں ناسہ چاہیے ہے؟'') اُسے باہر جاتے دیکھ کر پال گرفتھ نے کہا۔

''نو'' کرن ٹارن نے کہا۔

لیکن پال نے زبردستی اُس کے ہاتھ میں ایک نوٹ دے کر کہا

"Enjoy yourself old-man; this is your weekend on the beach"

(ارے میاں لطف اٹھاؤ، یہ تو تمہارا سمندر کے کنارے چھٹی کا دن ہے)

"Yes, two nights already"

(ہاں، دو راتیں تو گذر ہی چکی ہیں) کرن ٹارن نے کہا۔

سمندر پھر شوریدگی پر آمادہ تھا اور دھوپ تیز تھی۔ بچے ایک آلو کے چپس بیچنے والے کو گھیرے ہوئے تھے۔

اتنے بڑے ہجوم میں عجیب بات یہ تھی نہ کوئی بوڑھا آدمی تھا نہ بوڑھی عورت۔ ایسا لگتا تھا اس ملک میں بوڑھے اور بوڑھیاں گھر سنبھالنے کا کام کرتے ہیں اور صرف نوجوان اور بچے ہی سمندر کے کنارے چھٹی منانے جاتے ہیں جو سب کے سب تندرست اور خوش پوش تھے۔ یا یہ کہ بوڑھے یہاں چھٹی منانے کے تصور کو بھی وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بھول جاتے ہیں۔

ہوٹل سیرینیڈ کی سمندر کے رخ کھلنے والی سیڑھیاں بڑھاپے میں ہلنے والی داڑھوں کی طرح اپنی نیو کب کی چھوڑ چکی تھیں اور تقریباً اوندھی ہوئی پڑی تھیں۔ بچے پانی میں سے نکل کر ان سیڑھیوں اور ہوٹل کے صحن کے بیچ کی کھائی کو پھلانگ کر اندر آ اور جا رہے تھے۔ رنگین چھتریوں کے نیچے بیٹھے ہوئے ان کے ماں باپ بیئر یا چائے پی رہے تھے— اور بچے ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر کوک یا آئیس کریم کے لیے چلاتے تھے۔ ہوٹل کی بزنس زوروں پر تھی۔

کرن ٹارن ہوٹل کے کمروں کے سامنے سے گذرا جن میں بیرے

پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لے جا رہے تھے۔ ہر کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی اور کھلا ہوا دروازہ زندگی کا ایک فریم تھا جو آج کے بعد کرن ٹارن کو معلوم تھا ہمیشہ کے لیئے اس کے ذہن پر اپنی تصویر چھوڑ جائیے گا۔ مثلاً وہ لڑکی جو اسپرنگ کے بستر پر اوندھی لیٹی ہوئی سر اٹھائیے سمندر کو دیکھ رہی تھی اور ہوا میں اٹھی ہوئی اس کی ٹانگیں لہروں کے ساز پر ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔

ہوٹل کی بار اندر سے اندھیری تھی اور اُس کی ہر چیز سے بوسیدگی ہویدا تھی۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر وہ بھی اس ماحول کا ایک فرد بننا چاہتا تھا لیکن کوئی لڑکی اس کی میز پر آ کر نہیں بیٹھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بار میں صرف وہی لڑکیاں تھیں جو کسی کے ساتھ یہاں آئی تھیں، زاید ایک بھی نہیں تھی۔ انکے ساتھ کے مرد خاموشی سے بیٹھ کر بیئر یا وھسکی پیتے تھے جس میں وہ انکا ساتھ نہیں دیتی تھیں اور گفتگو اگر کوئی ہوتی بھی تھی تو سازش کی سی کھس کھس میں۔ ہال میں نہ کسی قسم کی موسیقی تھی نہ روشنی۔ ایک سرے پر ایسا لگتا تھا پہلے کبھی آرکیسٹرا کے لیئے جگہ بنائی گئی ہوگی۔ وہاں اب ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا پلیٹ فارم رہ گیا تھا اور ایک جالے لگا ہوا پیانو۔ ڈائیس کے عین اوپر ایک روشندان دیوار سے گرنے کے لیئے جھول رہا تھا۔ کرن ٹارن خاموشی سے بیئر پینے لگا۔

ہوٹل کے باہر اُسنے ایک بڑی سی کار کو آ کر رکتے دیکھا۔ پھر کار کے دروازے کھلنے اور ایک ساتھ بند ہونے کی آواز آئی۔ کھڑکی کے فریم میں اُسنے ایک چھریرے جسم کی نوجوان عورت

کو دھوپ کا چشمہ لگائے بار کی طرف آتے دیکھا۔ اُس کا ساتھی بھاری بھرکم تھا اور گجھی ہوئی سایڈ بوئس اور دھوپ کے چشمے کے بعد اُسکا چہرہ بمشکل ہی کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ باقی سب ٹھوڑی کے نیچے لٹکا ہوا گوشت تھا۔

دونوں بار کے دستور کے مطابق سمندر کو بغیر دیکھے ہوئے ایک کونے میں پڑی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔

گاہے گاہے لوگ اپنی میزوں پر سے اٹھتے تھے اور اُنکے جانے کے بعد میز پر بیئر کے گلاس کے دھبے اور بکھری ہوئی شراب رہ جاتی تھی۔ تقریباً سب ہی سی گلز، سمندر کی لہروں اور اس کے شور سے نا آشنا اور بے نیاز تھے۔ جیسے ان سے بھی زیادہ کوئی خوبصورت چیز انہیں یہاں کھینچ کر لائی تھی۔ اور جب وہ ہوٹل سے اٹھ کر واپس اپنی کاروں کی طرف چلے جاتے تھے تو ایسا لگتا تھا وہ سمندر کو اپنے پیر چھونے دینے کے بھی روادار نہیں ہیں۔

کچھ دیر بعد چھریرے جسم والی عورت اور اس کا ساتھی بھی بیئر ہال سے باہر چلے گئے۔

کرن ٹارن اُس ماحول سے اکتا چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا باہر جا کر اُن بچوں میں مل جائے۔ سمندر کے کنارے ریت پر بھاگے اور کیکڑوں پر جھپٹا مارے جیسے وہ اور اس کے بچے کرتے تھے لیکن 'لیکن،' اُسنے سوچا 'یہ شہر دنیا کے اور تمام شہروں سے مختلف ہے، اسکا اپنا مزاج ہے، اپنا رنگ...'

جب وہ بار سے اٹھ کر باہر جا رہا تھا تو اُسنے سائیڈ برنس والے مرد کو چھریرے جسم والی عورت کے ساتھ کار میں واپس جاتے دیکھا۔
'اتنی جلدی ..' کرن ٹارن نے سوچا 'اور وہ بھی بغیر سمندر کی طرف دیکھے !'

دن بھر وقفے وقفے سے چوکیداروں اور مفت میں برآمدوں میں سایہ ڈھونڈھنے والوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ بیچ پر پھر سے اندھیرا اترنے لگا۔
ایک ایک کرکے کھڑکیاں اور دروازے بند ہوتے جا رہے تھے۔ ہوٹل سیرینیڈ کے بیرے ریزگاری گن رہے تھے اور چھتریاں اتار اتار کر ہال میں بند کی جا رہی تھیں۔ کاروں کی ایک لمبی قطار شہر کی طرف چلی جا رہی تھی اور ایک بار پھر انکی وجہ سے ریت کے ذرے ہوا میں جگمگا رہے تھے۔
نیگرو لڑکے اور بوڑھے گھوڑوں اور اونٹوں کو لیے کر کب کے اپنے گاؤں جا چکے تھے جہاں چھتوں میں سے سفید دھواں سرخ آسمان کے چہرے پر اڑ رہا تھا۔

جانے سے پہلے سرجن سب کو یاد دلانے آیا کہ رات کا کھانا مع نووارد اُس کے گھر ہے۔
کرن ٹارن کے ساتھی بھی جانے کے لیئے اپنا سامان کار میں لاد رہے تھے۔
جب وہ لوگ کرن ٹارن کو اپنے ساتھ لیے شہر جانے والی سڑک

پر پہنچے تو دور سے کرن ٹارن کو بیچ ویسی ہی نظر آئی جیسی دو رات پہلے تھی اور پہاڑی پر بسا ہوا شہر تا حدنگاہ ایک طرف سے دوسری طرف کو پھیلا ہوا تھا، خاموش اور شانت۔ کتے تک غایب ہو چکے تھے۔

تھوڑی دور جانے پر اُسے سڑک کے کنارے بہت سے لوگ کھڑے نظر آئے جو ہر گذرنے والی کار کو رکنے کے لئے ہاتھ دکھاتے تھے۔

کرن ٹارن کو اُس لڑکی اور نوجوان کا خیال آیا، کہیں وہ بھی تو اسی بھیڑ میں نہیں ہیں۔

لیکن اُسی وقت سامنے سے ایک بس دھول اڑاتی ہوئی آئی، لوگ اس کے رکنے سے پہلے ہی اسکی طرف دوڑے۔ بس تیزی سے اُسی سمت گھوم گئی جدھر سے آئی تھی۔ جیسے ڈرائیور اُسے ہجوم سے بچا رہا ہو۔ لوگ ایک ساتھ ہر کھڑکی اور دروازے سے اُس پر چڑھنے لگے جیسے گہری سیاہ رات میں ڈوب جانے سے بچنا چاہتے ہوں۔

اُسنے دیکھا بس کی چھت پر بھی لوگ چڑھ رہے ہیں۔ پھر ایکدم بس چل پڑی، لوگ اُس کے پیچھے دوڑنے لگے۔

کرن ٹارن نے چونک کر کہا— "It sank" (ڈوب گئی)
پال کرفتھ نے اُسے کندھے سے ہلاتے ہوئے کہا "جاگ جاؤ ملاح۔ تم کار میں بیٹھے ہو کشتی میں نہیں"۔

"سمندر کے ساحل پر تمہارا ویک اینڈ ختم ہوا" اولا ویلڈ کیمپ بولی۔

کھو کھلا شہر

ہجوم بہت پیچھے رہ گیا تھا اور سامنے سردیوں کے شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

انتساب

کراچی میں بسنے والے اُن لاکھوں بچوں،
بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کے نام
جو سمندر سے ہزاروں میل دور ہیں۔

○

کھوکھلا شہر
ماہنامہ افکار، کراچی۔ اپریل ۱۹۷۸ء
۹۷/۳۴، ۱۱۲ تا ۱۲۵

فائل نمبر ۷/

جنگلات

جلد ۳

فائل نمبر ۷/جنگلات ۔ جلد ۳

(جنگلی جانوروں کے تحفظ کے قانون کے تحت دئیے جانے والے لائسینس اور پرمٹ، مع چڑیوں کے شکار کے اجازت ناموں کے)

(صفحہ ۱)

از طرف ساکنان موضع ایڈورو

۲۸- جولائی ۱۹۶۴ء

بنام ڈیویژنل افسر صاحب بہادر

اگالا ڈیویژن

ایک درخواست

جناب عالی ۔

ہم موضع ایڈورو کے ساکنان پچھلے چند سالوں سے انتہائی تکلیف اور پریشانی کے حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے علاقہ میں دریا پار سے ہاتھیوں کا ایک جھنڈ وقت بے وقت داخل ہوکر ہماری فصلوں کو تاراج کرتا ہے اور بسا اوقات راہ گیروں اور کھیت میں کام کرنے والوں کے درپئے آزار ہوتا ہے۔

ان جانوروں کی تعداد اب اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ جز خدا کوئی نہیں جانتا کہ اس علاقے میں کل کتنے ہاتھی ہیں۔

ایک موقعہ پر جب ایک لڑکے کا پیچھا ایک پاگل ہاتھی نے کیا تھا اور وہ جان بچانے کے لئے بھاگتا ہوا ایک اندھے کوئیں

میں جا گرا تو گھبراہٹ میں اسکی عقل کئی دن کو گم ہوگئی۔ بعد میں اُسنے بتایا رات بھر ہاتھی ہر طرف سے چنگھاڑتے رہے تھے اور جس ہاتھی نے اسکا پیچھا کیا تھا جھک جھک کر اسے سونڈ سے پکڑنے کی کوشش کرتا رہا اور ناکام ہونے پر اُسنے کوئیں میں مٹی کے ڈھیلے بھی پھینکے تھے۔

ہمارے گاؤں میں ایک بڑا تالاب ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہوجاتا ہے اور سوکھے مہینوں اور پت جھڑ میں یہ پانی ہم لوگ پینے کے کام میں لاتے ہیں۔ ان موزیوں نے پچھلے سال اس تالاب کو پی پی کر خالی کردیا یہاں تک کہ تالاب کا تلہ نظر آنے لگا تھا اور ہمارے گاؤں کی عورتوں کو پانی لینے کے لئے چار کوس سے زیادہ چل کر چڑھائی چڑھ کر نزدیک کی ندی تک جانا پڑتا تھا۔ رات ہوتے ہی ہاتھی ہی ہاتھی ہمارے کھیتوں میں آ جاتے تھے اور گنے کھا کر اسی تالاب سے پانی پیتے تھے۔ یہ سلسلہ ۶ ماہ جاری رہا اور تالاب بالکل خشک ہوگیا۔

اب بارشوں سے تالاب پھر بھرا ہے اور خطرہ ہے اگر ان بدمعاشوں سے اب بھی چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوئی تو پھر وہی ہوگا اور گاؤں بھر پانی کی بوند کو ترسے گا۔

ہمارے علاقے میں کسی کے پاس بندوق نہیں۔ یہاں کچھ عیسائی مشنری ہیں لیکن وہ گرام سدھار کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی کے پاس بندوق ہے۔ رومن کیتھولک فادر نے کئی بار امریکن پیس کور والوں سے دو ایک ہاتھی مارنے کی درخواست کی تاکہ باقی ماندہ درندے خوف زدہ ہوکر بھاگ جائیں لیکن امریکن پیس کور والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کے پاس ممنوعہ جانوروں کے شکار کا لائسینس نہیں ہے۔

فائل نمبر ۷/جنگلات۔ جلد ۳

(جنگلی جانوروں کے تحفظ کے قانون کے تحت دئیے جانے والے لائسنس اور پرمٹ، مع چڑیوں کے شکار کے اجازت ناموں کے)

(صفحہ ۱)

از طرف ساکنان موضع ایڈورو
۲۸- جولائی ۱۹۶۴ء

بنام ڈیویژنل افسر صاحب بہادر
اکالا ڈیویژن

ایک درخواست

جناب عالی۔

ہم موضع ایڈورو کے ساکنان پچھلے چند سالوں سے انتہائی تکلیف اور پریشانی کے حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے علاقہ میں دریا پار سے ہاتھیوں کا ایک جھنڈ وقت بے وقت داخل ہوکر ہماری فصلوں کو تاراج کرتا ہے اور بسا اوقات راہ گیروں اور کھیت میں کام کرنے والوں کے درپئے آزار ہوتا ہے

ان جانوروں کی تعداد اب اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ جز خدا کوئی نہیں جانتا کہ اس علاقے میں کل کتنے ہاتھی ہیں۔

ایک موقعہ پر جب ایک لڑکے کا پیچھا ایک پاگل ہاتھی نے کیا تھا اور وہ جان بچانے کے لئے بھاگتا ہوا ایک اندھے کوئیں

میں جا گرا تو گھبراہٹ میں اسکی عقل کئی دن کو گم ہو گئی۔ بعد میں اُسنے بتایا رات بھر ہاتھی ہر طرف سے چنگھاڑتے رہے تھے اور جس ہاتھی نے اسکا پیچھا کیا تھا جھک جھک کر اسے سونڈ سے پکڑنے کی کوشش کرتا رہا اور ناکام ہونے پر اُسنے کوئیں میں مٹی کے ڈھیلے بھی پھینکے تھے۔

ہمارے گاؤں میں ایک بڑا تالاب ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہوجاتا ہے اور سوکھے مہینوں اور پت جھڑ میں یہ پانی ہم لوگ پینے کے کام میں لاتے ہیں۔ ان موزیوں نے پچھلے سال اس تالاب کو پی پی کر خالی کردیا یہاں تک کہ تالاب کا تلہ نظر آنے لگا تھا اور ہمارے گاؤں کی عورتوں کو پانی لینے کے لئیے چار کوس سے زیادہ چل کر چڑھائی چڑھ کر نزدیک کی ندی تک جانا پڑتا تھا۔ رات ہوتے ہی ہاتھی ہی ہاتھی ہمارے کھیتوں میں آ جاتے تھے اور گنے کھا کر اسی تالاب سے پانی پیتے تھے۔ یہ سلسلہ ۶ ماہ جاری رہا اور تالاب بالکل خشک ہو گیا۔

اب بارشوں سے تالاب پھر بھرا ہے اور خطرہ ہے اگر ان بدمعاشوں سے اب بھی چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوئی تو پھر وہی ہوگا اور گاؤں بھر پانی کی بوند کو ترسے گا۔

ہمارے علاقے میں کسی کے پاس بندوق نہیں۔ یہاں کچھ عیسائی مشنری ہیں لیکن وہ گرام سدھار کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی کے پاس بندوق ہے۔ رومن کیتھولک فادر نے کئی بار امریکن پیس کور والوں سے دو ایک ہاتھی مارنے کی درخواست کی تاکہ باقی ماندہ درندے خوف زدہ ہوکر بھاگ جائیں لیکن امریکن پیس کور والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کے پاس ممنوعہ جانوروں کے شکار کا لائسینس نہیں ہے۔

دو ماہ ہونے آئے سارجنٹ محمدو نے جو رٹائیرڈ فوجی افسر ہے اپنی توڑے دار بندوق سے ایک ہاتھی کو جو اس کے کمپاؤنڈ میں گھس آیا تھا اور دیوار سے اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا نشانہ کیا تھا۔ لیکن بندوق کی نالی پھٹ گئی اور خود سارجنٹ محمدو کا منہہ جھلس گیا۔ خوش قسمتی سے ہاتھی موصوف نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی ورنہ کام بگڑ جاتا۔

آپ سے درخواست ہے ہم ساکنان موضع ایڈورو کی حفظ و بقا کے لئے کوئی موثر قدم اٹھایا جائے تا کہ جلد سے جلد ان شیطانوں سے نجات ہو اور ہم اطمینان سے اپنے کام پر جا سکیں، بچے اسکول جانے لگیں اور عورتوں کو کوسوں پانی کی کھوج میں نہ جانا پڑے۔ ہم سب اس علاقے کے آزاد باشندے ہیں اور آپکی توجہہ اور کرم گستری کے متمنی۔

(چند دستخط اور ۱۸ دیہاتی انگوٹھوں کے نشان)

صفحہ (۲)

صوبائی دفاتر، نکوجا — بنام ڈویژنل افسر
۲- اگست ۱۹۶۴ء — اگالا ڈیویژن

اسوقت تمہارا ۳۰ جولائی ۱۹۶۴ کا خط زیر حوالہ ہے جس میں تم نے ایڈورو کے جنگلوں میں ایک نر ہاتھی کو مارنے کی اجازت طلب کی تھی۔

اس باب میں تمہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ تمہاری یہ درخواست میں محکمۂ جنگلات کے صوبائی افسراعلیٰ کو بھیج چکا ہوں جو کہ اس پرمٹ کو جاری کرنے کا اہل ہے اور جس کے پاس وزارت حیوانات و جمادات کے مستقل سیکریٹری کے احکامات کے تحت اولاً یہ درخواست جانی چاہیئے۔

وہاں سے جواب آتے ہی تمہیں اطلاع دی جائیگی۔

(دستخط) ٹی۔ فرگیوسن کورٹ لینڈ

ڈیویژنل افسر کا حاشیہ

محکمہ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ سے میری ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی۔ اُس نے اپنی وزارۃ کو فون کیا ہے اور وہاں سے جواب ملتے ہی مجھے فون پر آگاہ کرے گا۔

(دستخط) بابا یو اسرنی — ۳۔ اگست ۱۹۶۴ء

ایک اور حاشیہ

ایورے کو مطلع کیا گیا۔

(کسی نامعلوم کلرک کے دستخط)

صفحہ (۳)

ایک تار

تار کا پتہ ''درخت لکوجا''

* ڈی۔ او۔ اگالا کے نام

تمنے جو درخواست صوبائی سیکریٹری کو بھیجی تھی اسکے حوالے سے تمہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ اس اجازت نامے کی تاریخ اجراء سے تین ماہ کے اندر اندر کوئی معقول شکاری ایڈورو کے جنگلوں میں ایک نر ہاتھی کا شکار کر سکتا ہے۔ وقف۔ یہاں تمہاری توجہہ قانون کے سیکشن ۴۵ کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ وقف۔ مزید کارروائی سے آگاہ رکھا جائے۔

ڈیویژنل افسر کا حاشیہ

مسٹر اوڈانگ سیکشن ۴۵ میرے مطالعے کے لئے پیش کیا جائے۔

متعلقہ کلرک کا حاشیہ

ضروری سرکلر کے لئے صفحہ ۴ دیکھیئے۔

(دستخط اوچ اوڈانگ)

---

* ڈیویژنل افسر

صفحہ (۴)

جنگلی جانوروں کا قانون مجریہ ۱۹۶۳ (۱۹۶۳ کا نمبر ۱۶)
حکومت کی ملکیت کو ٹھکانے لگانے سے متعلق ہدایات

اس قانون کی ایک شق کے ماتحت بغیر لائسنس بعض مخصوص حالات میں ایک ممنوعہ جانور کا شکار کیا جا سکتا ہے۔ لائسنس کی قید سیکشن ۷ کے تحت ہے لیکن سائینسی تحقیق، نظم و نسق کی برقراری اور جان و مال کی حفاظت کے لئے سیکشن ۵، ۱۱ اور ۴۴ کے تحت یہ محفوظ اور ممنوعہ جانور بھی پکڑے یا مارے جا سکتے ہیں۔

اسی قانون کے تحت ایسے ممنوعہ اور محفوظ جانور کی لاش پانے والے فرد یا افراد کے لئے بھی احکامات موجود ہیں یعنی ان تمام مخصوص حالات میں جب شکار کا لائسنس حاصل نہ کیا گیا ہو یا مندرجہ بالا مقاصد میں سے کوئی ایک پیش نظر ہو تو پائی جانے والی یا شکار کئے ہوئے جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی (سیکشن ۴۰)

نظم و نسق کی برقراری کے لئے مارے ہوئے جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی اور شکار کا محافظ اہلکار اُسے فروخت کرکے رقم سرکاری خزانے میں داخل کریگا۔ (سیکشن ۵۰)

سیکشن ۱۱، ۴۲ اور ۴۳۔ شکاری سیکشن ۱۱ کی رو سے اور لاش پانے والا فرد ۴۲ اور ۴۳ کے تحت اگر لائسنس یافتہ نہیں ہیں اور ان میں سے کوئی سیکشن ۵ کی رو سے بھی شکار کھیلنے کا مجاز نہیں تھا تو کشتہ جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی جیسا کہ اوپر سیکشن ۴۰ کے تحت درج کیا گیا ہے اور مندرجہ

صفحہ (۳)

ایک تار

تار کا پتہ ''درخت لکوجا''
* ڈی۔ او۔ اگالا کے نام

تمنے جو درخواست صوبائی سیکریٹری کو بھیجی تھی اسکے حوالے سے تمہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ اس اجازت نامے کی تاریخ اجراء سے تین ماہ کے اندر اندر کوئی معقول شکاری ایڈورو کے جنگلوں میں ایک نر ہاتھی کا شکار کر سکتا ہے۔

وقف۔ یہاں تمہاری توجہ قانون کے سیکشن ۵۴ کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ وقف۔ مزید کارروائی سے آگاہ رکھا جائے۔

ڈیویژنل افسر کا حاشیہ

مسٹر اوڈانگ سیکشن ۵۴ میرے مطالعے کے لئے پیش کیا جائے۔

متعلقہ کلرک کا حاشیہ

ضروری سرکلر کے لئے صفحہ ۴ دیکھیئے۔

(دستخط اوچ اوڈانگ)

---

* ڈیویژنل افسر

صفحہ (۴)

جنگلی جانوروں کا قانون مجریہ ۱۹۶۳ (۱۹۶۳ کا نمبر ۱۶)
حکومت کی ملکیت کو ٹھکانے لگانے سے متعلق ہدایات

اس قانون کی ایک شق کے ماتحت بغیر لائسنس بعض مخصوص حالات میں ایک ممنوعہ جانور کا شکار کیا جا سکتا ہے۔ لائسنس کی قید سیکشن ۷ کے تحت ہے لیکن سائنسی تحقیق، نظم و نسق کی برقراری اور جان و مال کی حفاظت کے لئے سیکشن ۵، ۱۱ اور ۴۴ کے تحت یہ محفوظ اور ممنوعہ جانور بھی پکڑے یا مارے جا سکتے ہیں۔

اسی قانون کے تحت ایسے ممنوعہ اور محفوظ جانور کی لاش پانے والے فرد یا افراد کے لئے بھی احکامات موجود ہیں یعنی ان تمام مخصوص حالات میں جب شکار کا لائسنس حاصل نہ کیا گیا ہو یا مندرجہ بالا مقاصد میں سے کوئی ایک پیش نظر ہو تو پائی جانے والی یا شکار کئے ہوئے جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی (سیکشن ۴۰)

نظم و نسق کی برقراری کے لئے مارے ہوئے جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی اور شکار کا محافظ اہلکار اسے فروخت کرکے رقم سرکاری خزانے میں داخل کریگا۔ (سیکشن ۵۰)

سیکشن ۱۱، ۴۲ اور ۴۳۔ شکاری سیکشن ۱۱ کی رو سے اور لاش پانے والا فرد ۴۲ اور ۴۳ کے تحت اگر لائسنس یافتہ نہیں ہیں اور ان میں سے کوئی سیکشن ۵ کی رو سے بھی شکار کھیلنے کا مجاز نہیں تھا تو کشتہ جانور کی لاش حکومت کی ملکیت متصور ہوگی جیسا کہ اوپر سیکشن ۴۰ کے تحت درج کیا گیا ہے اور مندرجہ

بالا طور ہی سے فروخت ہوگی۔

سیکشن ۴۴ اگر مرنے والا ہاتھی نہیں تھا اور مارنے والا سرکاری ملازم نہیں ہے تو لاش بطور تحفہ مارنے والے کو دی جا سکتی ہے۔ بصورت دیگر حکومت لاش کی قیمت کا ۵۰ فیصدی تک مارنے والے کو انعام دے کر لاش خود رکھ سکتی ہے۔

اگر کشتہ جانور ہاتھی تھا تو دانت سیکشن ۴۵ کے تحت جنگلات کے صوبائی محافظ شکار کے حوالے کئے جائیں گے اور لاش مندرجہ بالا طریقے سے ٹھکانے لگائی جائے گی۔ بحالیکہ مارنے والا سرکاری ملازم ہے تو یہ کار اس کے فریضہ میں شمار ہوگا اور لاش کی قیمت سرکاری خزانے میں داخل ہوگی۔

سیکشن ۵ یا ۴۴ کے تحت پکڑا ہوا جانور حکومت کی ملکیت متصور ہوگا اور کسی چڑیا گھر یا تحقیقاتی ادارے کے سپرد کیا جائے گا۔

سیکشن (۳) ۴۲ لاش پانے پر انعام کی رقم لاش کی قیمت فروخت کے نصف سے متجاوز نہیں ہونی چاہیئے۔

(دستخط) جون ہورسیک
چیف کنزرویٹر محکمہ جنگلات

۲ جون ۱۹۶۳ء

صفحہ (۵)

از طرف مسٹر یعقوبو لاوال
معرفت افورگنگم پرائمری اسکول
افورگنگم
اگالا ڈیویژن
۰۶ اگست ۱۹۶۴ء

بنام ڈیویژنل افسر صاحب بہادر
اگالا ڈیویژن
(عالیجناب بابایو اسرتی کی توجہہ کے لئے)

جناب من۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میری بیویاں اور بچے اور کنبے کے جملہ افراد جو سب کے سب آپکو آپ کے بچپن سے جانتے ہیں آپ کے حق میں دعاگو ہیں کہ آپ، میڈم اور پانچوں بچے خیریت سے ہوں۔

اگر آپ مجھے بھول گئے ہیں تو میں آپ کو یاد دلا سکتا ہوں کہ آپ اور میں دونوں ایک ہی گاؤں اور ضلع کے باشندے ہیں اور آپ کی والدہ مرحومہ کو میں آپ کے باپ کے لئے بیاہ کر لایا تھا۔ اور آپ کا باپ اور میں حالانکہ مختلف قبیلوں سے تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کو ایسا جانتے تھے گویا ایک باپ اور ایک ماں سے ہوں۔

مجھے معلوم ہے آپ بہت مصروف آدمی ہیں اور آپ کا وقت ضائع کرنے کا مجھے اختیار نہیں لیکن اس وقت میں مجبور ہوکر یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ہمارے اطراف میں ہپو پوٹیمس بہت بڑھ گئے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے اکیلے دریائے انمبرا میں کچھ نہیں تو کئی سو ہونگے۔ خود میں نے ایک بھی ہپو پچھلے

چند سالوں میں دریا میں نہیں دیکھا ہے لیکن اس کی وجہہ دوسری ہے۔ میرا عرصہ سے دریا کے نزدیک یا پار جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ میری سب سے چھوٹی بیوی، جب کینوء میں دریا پار کر رہی تھی تو اُسنے ایک سیاہ ہپو کو پانی کی سطح سے سر اٹھاتے دیکھا تھا۔ گاؤں کے دوسرے افراد بھی مجھے معلوم ہے مجھ سے یہ کہنے میں اتفاق کریں گے کہ دریا میں ہپو اتنے ہی ہیں جتنی مچھلیاں۔

ان ہپوؤں سے ہم سب کی جان ضیق میں آ گئی ہے۔ کیونکہ رات ہوتے ہی یہ درندے پانی سے نکل نکل کر ہمارے مکئی کے کھیتوں میں آن پڑتے ہیں اور رات بھر ہمیں مکئی کے ڈنٹھلوں کے چٹخنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے فضلے سے جو کہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ہمیں ڈر ہے کہ کوئی منحوس بیماری جلد ہی پھیلنے والی ہے مثلاً چیچک یا طاعون۔

پچھلے سال ایک شکاری نے جو کسی اور علاقے سے اس طرف آیا تھا اور جس کے پاس محفوظ جانوروں کو مارنے کا لائسنس بھی تھا ایک بڑے نر ہپو کو افور گفگم کے دلدلی علاقے میں شکار کیا تھا۔ یہ ہپو اتنا بڑا تھا کہ اگر کسی خشک جگہہ پر بھی مارا گیا ہوتا تو اس کی لاش اٹھانے کے لئے کرین اور لیجانے کو ٹرک درکار ہوتی۔ میرا خیال ہے اس ہپو میں (جو ہماری مکئی کھا کھا کر پلا تھا) کئی فلانی بیلوں جتنا گوشت تھا۔ چنانچہ جب اُس شکاری نے گوشت بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے گاؤں کے امن پسند سیانے لوگوں اور بازار جانے والی عورتوں نے ایک خفیہ میٹنگ کی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ ہپو ہمارے بھٹے کھا کھا کر فربہ ہوا تھا اس لئے اس کا گوشت ہمیں ملنا چاہئے۔

اور شکاری چاہے تو شکاری ورنہ حکومت اس کی کھال جیسا کہ کہا جاتا ہے بطور ٹرافی لیجائے ہمیں اعتراض نہ ہوگا۔ کیونکہ کھال بہرحال نمائش کی چیز ہے اور ہمارے نزدیک غیر ضروری۔

اس لئے جب شکاری نے گوشت بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہم سب نے کہا جب تک میڈیکل افسر آکر پاس نہ کردے ہم گوشت نہیں خرید سکتے۔ مجبوراً شکاری نے اپنے لڑکے کو میڈیکل افسر کے پاس دوڑایا جو یہاں سے ۱۸ میل کے فاصلے پر رہتا ہے۔ اس آنے جانے میں کئی گھنٹے لگ گئے اور لاش پر مکھیاں گرنے لگیں۔ دوپہر کے بعد یوروپین ڈاکٹر افور گنگم اپنی موٹر میں پہنچا اور وہاں سے اُسے سائیکل پر دو میل کھیتوں میں لیجایا گیا۔ پھر دلدل شروع ہوجاتی ہے اور اُسے اس میں بوٹوں سمیت چلکر جانا پڑا۔ چنانچہ جب وہ لاش کے پاس پہنچا تو بھنایا ہوا تھا اور پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں درخت اتنے بلند اور گنجان ہیں کہ دن میں بھی اندھیرا رہتا ہے اور مچھر کاٹ کاٹ کر بوٹیاں اڑائے دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر کو لاش ٹھیک سے نظر بھی نہیں آرہی تھی بہرحال اُسنے شکاری سے کہا جب تک گوشت ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کے سامنے کسی خشک جگہ پر نہ رکھا جائے وہ سرٹیفکٹ نہیں دیگا۔

جبراً قہراً شکاری کو وہیں قصاب بننا پڑا اور اس کام میں بہت سے آدمیوں اور لڑکوں نے خوشی خوشی اسکا ہاتھ بٹایا۔ اب مسئلہ گوشت کو سڑک تک لیجانے کا تھا۔ یہاں پھر ہمارے گاؤں والوں کی خوش خلقی کام میں آئی اور ہر آدمی رضاکارانہ گوشت کے بُچے ؏ اُٹھانے پر آمادہ ہوگیا۔ چنانچہ جب یہ قافلہ دلدل میں روانہ ہوا تو سوائے ڈاکٹر کے ہر فرد کے سر پر گوشت کا

ایک بُوڑھا تھا۔ اور قافلہ سالاری کے فرائض خود اجنبی انجام دے رہا تھا۔ لیکن جب ہم سڑک پر پہنچے تو سوائے مجھ سمیت دو ایک بڈھوں، میڈیکل افسر اور شکاری کے وہاں کوئی اور نہ تھا اور ہُو کا نشان تک مٹ چکا تھا۔

چنانچہ ان حقائق کی روشنی میں یہ درخواست لکھ کر میں آپ سے دو نوازشوں کا خواستگار ہوں:

۱- میرے بھتیجے یوسفولاوال کو جو ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء کو یہاں ایک مہینے کی سالانہ چھٹی پر آئے گا اور جس کے پاس شکار کا لائسنس بھی ہے ایک عدد نر ہپو پوٹیمس مارنے کا اجازت نامہ عطا فرمایا جائے۔ اس درخواست کے ہمراہ ایک کراسڈ پوسٹل آرڈر ۲ پونڈ رقم کا جو کہ پہلا ہپو مارنے کی فیس ہے ملفوف ہے۔

۲- چونکہ شکار کے بعد میڈیکل افسر کے پاس اطلاع بھیجنے اور ان کے آنے میں کئی گھنٹے ضائع ہوتے ہیں اور آج کل سخت گرمی کی وجہ سے تھوڑی ہی دیر میں گوشت کے خراب ہوجانے کا احتمال رہتا ہے اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ مجھے گوشت کو فروخت کرنے کا پرمٹ بھی صادر کیا جائے۔ بسا اوقات میڈیکل افسر کے دورے پر چلے جانے کی بنا پر اُن سے رابطہ ناممکن ہو جاتا ہے اس لئے اس پرمٹ کا پہلے سے لے لیا جانا اور بھی ضروری ہے۔

ان درخواستوں کی منظوری اور اس خط کو توجہ سے پڑھنے پر میں، میری بیویاں اور بچے تا عمر آپ کی درازیٔ عمر اور میڈم اور بچوں کے لئے دعائے خیر مانگیں گے اور میں دعا کرتا ہوں کہ آپکی بیویوں اور بچوں کی تعداد میں مستقل

اضافہ ہوتا رہے اور آپکا کنبہ ایک دن آپ کے باپ کے کنبے سے بھی بڑھ جائے جو اپنے زمانے میں دور و نزدیک سب کے لئے باعث رشک تھا۔

آپکا مخلص اور تابع فرمان
مسٹر یعقوبو لاوال
معرفت افور گنگم پرائمری اسکول
افور گنگم براستہ ایڈورو
اگالا ڈیویژن

ڈیویژنل افسر کا نوٹ:

ضروری کارروائی کی جائے۔

(دستخط) بابایو اسرتی

۱۲۔ اگست ۱۹۶۴ء

صفحہ (٦)

ڈیویژنل افسر کا خط صوبائی افسر جنگلات اور قومی محافظ شکار کے نام

اکالا ڈیویژن

۱۲ اگست ۱۹٦۴ء

مجھے یہ لکھنے میں مسرت ہے کہ کل یہاں ایک ہاتھی کا بچہ ایڈورو کے جنگلوں میں پکڑا گیا ہے جسکی ماں حادثاتی طور سے شکار کے دوران ماری گئی تھی۔ یہ اقدام محکمۂ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ سے اجازت مل جانے پر کیا گیا ہے۔ بچہ خیریت سے ہے اور فی الوقت یہاں کے سردار عطا گالا کے محل میں رکھا گیا ہے جہاں اسکی دیکھ بھال پولیس کے سپاہی، میڈیکل افسر کی نگرانی میں کر رہے ہیں۔ مناسب انتظام ہوجانے پر بچے کو قومی چڑیا گھر جوس بھیجدیا جائے گا۔ اس باب میں صوبائی سیکریٹری پہلے ہی وزارۃ حیوانات اور جمادات کو ایک مراسلہ بھیج چکے ہیں۔

آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ قومی چڑیا گھر کے نگران سے مشورہ کرکے مجھے بچہ کی خوراک سے متعلق ہدایات بذریعہ تار بھیجی جائیں۔

(دستخط) بابایو امرتی
ڈیویژنل افسر

فائل نمبر ۔

صفحہ (۷)

ایک تار

تار کا پتہ ''جانور'' جوس

ہاتھی کے بچے کو تین پائنٹ پانی - وقف - دو آؤنس دودھ کا پاؤڈر - وقف - پاؤ پاؤنڈ مکھن اور چٹکی بھر پوٹاسیئم سٹریٹ چار چار گھنٹے کے وقفہ سے دیا جائے -

صفحہ (۸)

محکمۂ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ کا خط
ڈیویژنل آفیسر اگالا کے نام

سارجنٹ سیمسن باگانا نے جو مقامی لشکر پولیس میں سپاہی کی حیثیت سے پچھلے ۱۴ سال سے کام کر رہا ہے دو سیانے ہاتھی مضروب کرنے اور مارنے اور ایک بچے کو پکڑنے کا اقرار کیا ہے۔ یہ بچہ ۱۱- اگست ۱۹۶۴ء کو عطا گالا کے محل میں لیجایا گیا تھا جہاں اس کی پرداخت میڈیکل آفیسر کے سپرد ہوئی تھی - اس وقت میری اطلاع کے مطابق وہاں تماشائیوں کا ایک ٹھٹ لگ گیا تھا اور دارالخلافہ سے شائع ہونے والے چند اخباروں نے جو ہمیشہ ایسے ہی موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں اس خبر کو ''اگالا میں ہاتھی کے بچے کی نمائش'' کے عنوان سے چھاپا تھا -

یہ خبر وزارۃ حیوانات اور جمادات کے بعض حلقوں میں خاصی تشویش سے پڑھی گئی کیونکہ بچے کے پکڑے جانے کا مطلب یہی لیا جا سکتا ہے کہ اسکی ماں مرنے والے ہاتھیوں میں سے ایک تھی۔ اگر واقعات یوں ہی ہیں تو سارجنٹ سیمسن باگانا ایک خلاف قانون حرکت کا مرتکب ہوا ہے۔

مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس بچے کو ""قوسی چڑیا گھر جوس"" کے حوالے کرنے کا پروگرام تھا اور چونکہ اگالا سے براہ راست کوئی ریل گاڑی جوس نہیں جاتی اور ایڈورو کے جنگلوں سے عطا گالا کے محل تک لینڈروور میں لیجائے جانے پر بچے نے الٹیاں شروع کر دی تھیں اس لئے اس کے سفر کے لئے ہوائی جہاز کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ اس اثنا میں بچے کو ایک خالی مکان میں رکھا گیا جہاں میڈیکل آفیسر کی اطلاع کے مطابق اُسے سپاہیوں نے ٹھنڈا دودھ پلا پلا کر اور رات بھر سردی میں سکڑا کر مار ڈالا اور بعد میں بچے کی کھال قوسی عجائب گھر جوس کو بھیجی گئی۔

ہاتھی کا بچہ قانون کی رو سے محفوظ جانور ہے اور سوائے سیکشن ۵، ۱۱ اور ۴۴ جنگلی جانوروں کے قانون مجریہ ۱۹۶۳ء کے کوئی اُسے پکڑنے یا مارنے کا مجاز نہیں۔

ایڈورو کے جنگلوں میں ایک ہاتھی کا بچہ پکڑ کر سارجنٹ مذکور نے قانون شکنی کی ہے جسکی سزا سیکشن ۵۳ کے تحت ہے اور وہ اس سزا کا مستوجب ہے۔

سیانے ہاتھی بھی ممنوعہ اور محفوظ جانور ہیں اور سوائے سیکشن ۵، ۱۱ اور ۴۴ کے اجازت نامے کے نہ کوئی شخص انہیں شکار کرسکتا ہے نہ صید — جز سیکشن ۷ (۱) کے۔

سوائے اس کے کہ سارجنٹ مذکور اگالا میں ہاتھی کے شکار کا ایک قابل منظور لائسینس پیش کرے اسکا یہ فعل خلاف قانون ہے۔ اس کے علاوہ سارجنٹ سیمسن باگانا نے ایک بچے والی ہتھنی کو شکار اور بچے کو گرفتار کیا۔ یہ سیکشن ۹ کی خلاف ورزی ہے اور اس پر اُسے سو پونڈ تک جرمانہ یا چھ ماہ کی قید یا دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں۔ صوبائی صدر مقام کے اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ اگالا میں کسی کو پچھلے چند ماہ میں ہاتھی کے شکار کا لائسینس نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے سارجنٹ باگانا سے ایک اور جرم سرزد ہوا ہے۔

میں نے اپنے ۳۔ اگست ۱۹۶۳ء کے تار میں تمہیں اجازت دی تھی کہ کوئی معقول شکاری اجازت نامے کی تاریخ اجراء سے تین ماہ کے اندر اندر ایڈورو کے جنگلوں میں ایک نر ہاتھی کا شکار کر سکتا ہے اور تمہاری توجہ قانون کے سیکشن ۵۳ کی طرف مبذول کرائی گئی تھی۔ اگر سارجنٹ مذکور اسی فری پرمٹ کے بوتے پر ایڈورو ہاتھی مارنے گیا تھا جو تمہیں دی گئی تھی تو بہت برا ہوا۔ کیا تم مقامی لشکر پولیس کے ایک سپاہی پر بھروسہ کر بیٹھے تھے؟ اُسے بغیر مناسب لائسینس کے وہاں ہرگز نہ جانا چاہیئے تھا۔ تم سے درخواست کی جاتی ہے کہ مقامی پولیس سے رابطہ پیدا کرکے سارجنٹ سیمسن باگانا کا بیان لو اور پھر میں کسی فیصلے پر پہنچ سکوں گا۔

(دستخط) الحسن زاریا
افسر اعلیٰ صوبائی محکمۂ جنگلات
صوبہ کابا

ڈیویژنل افسر کا حاشیہ

صوبائی محکمہ جنگلات کے افسر اعلیٰ کے اس خط کی نقول عطا گالا اور دیہی زمین اور جنگلات کے مقامی کاؤنسلر کو بھیجی جائیں جو سارجنٹ سیمسن پاگانا کو طلب کرکے اس کا بیان لینے کے مجاز ہیں۔

(دستخط) پاپایو امرتی
۲۷ اگست ۱۹۶۴ء

صفحہ (۹)

سارجنٹ سیمسن پاگانا کی واردات سے متعلق ایک یاد دہانی

صفحہ (۱۰)

ایڈورو کے جنگلات میں ایک بجے والی ہتھنی مارنے اور بچہ کو صید کرنے کی واردات سے متعلق ایک اور یاد دہانی —

دیہی زمین اور جنگلات کے مقامی کاؤنسلر کا ایک نوٹ:

فائل بہت دن کی ہز اکسیلینسی عطا گالا کے محل میں گئی ہوئی ہے۔ جب تک وہاں سے جواب نہ آئے میں مزید اقدام سے معذور ہوں۔

(دستخط) پاپائنڈے اوکفوراجی

صفحہ (۱۱)

محکمہ زراعت
پوسٹ بکس ۳۱
الکپا
۱۱ اگست ۱۹۶۴ء

ڈیئر جان

تمہارا خط نورا کے لندن سدھارنے سے ایک دن پہلے آیا تھا اس وقت میں سامان بندھوانے میں مصروف تھا اور میرا خیال ہے وہ خط نورا کے ساتھ ہی لندن چلا گیا۔ بہرحال خط کا مضمون اب بھی میرے ذہن میں ہے۔

مجھے یاد تھا کہ تمہارا سوئمنگ پول کا کارڈ اور بوٹ کلب کے کاغذات میری میز کی دراز میں پڑے ہیں۔ اس وقت دوسرا لفافہ میں بیکلے کو بھیج رہا ہوں اور اسی میں کارڈ اور کاغذات رکھ دونگا۔ مجھے امید ہے بیکلے آرمی ہیڈ کوارٹرز جاکر دونوں کی توسیع کرا لے گا۔

یہاں آج کل وقت گھونگھے کی چال چل رہا ہے۔ اتوار کو ہارٹلیز اور فورسائتھز اور میں دریا میں کشتی پر مچھلی کے شکار کو چلے جاتے ہیں۔ کینیڈین فادرز اور آئیرش سسٹرز کو چھوڑ کر یہاں ہم تین ہی غیر ملکی ہیں۔ چوتھے ڈچ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیونکہ وہ برج سے ناواقف ہے۔ نورا کی غیر موجودگی میں باورچی خانہ میری تحویل میں ہے اور پکانے کے نت نئے تجربوں سے توند گھٹ رہی ہے اور خرچہ بڑھ گیا ہے۔ تمہاری توند کا کیا حال ہے؟

میرا خیال ہے تم میرے بڑے لڑکے ائین سے نہیں ملے ہو۔ وہ شکار کا دھنی اور کھیلوں کا رسیا ہے اور ایک ماہ کی چھٹی پر دسمبر میں نورا کے ہمراہ میرے پاس آ رہا ہے۔ مجھے لکھو آیا اس کے لئے ہاتھی کے شکار کا بندوبست ہو سکتا ہے؟

میں تمہیں ۳۵ پونڈ کا ایک کراسڈ چیک بھیج رہا ہوں جس میں پہلا اور دوسرا ہاتھی مارنے کی فیس علی الترتیب ۱۵ اور ۲۰ شامل ہیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر تم محکمہ جنگلات کے صوبائی افسر اعلیٰ سے وقت نکال کر خود مل لو تا کہ لائسنس ملنے میں دقت نہ ہو۔

ائین پچھلے چھ ماہ سے مُصر ہے کہ اس دفعہ اسے ہاتھی پر نشانہ لگانے کا موقعہ ضرور ملنا چاہیئے۔ اگر اُسے یہ موقعہ نہیں ملا تو تم اچھی طرح جانتے ہو نورا اور وہ ملکر کسکو نشانہ بنائیں گے۔

جیکی کو پیار

تمہارا جیف راجر

فائل نمبر ۷

صفحہ (۱۲)

دفتر ڈیویژنل افسر
اگالا ڈیویژن
ستمبر ۱۹۶۴ء

مسٹر جیف راجر
صوبائی افسر محکمہ زراعت
پوسٹ بکس ۳۱
اڈکپا

ڈیئر مسٹر راجر

آپ کے ۱۱- اگست ۱۹۶۴ء کے نیم سرکاری مراسلے کے حوالے سے جو مسٹر جان کولن صوبائی انجنیئر لکوجا کے نام تھا آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کے صاحبزادے مسٹر ائین راجر ایڈورو کے جنگلات میں دسمبر ۱۹۶۴ء کی کسی تاریخ کو ۲ نر بالغ ہاتھی شکار کر سکتے ہیں۔

لائسینس اور ۳۵ پونڈ کی رسید اس اجازت نامے کے ساتھ منسلک ہیں۔

مزید تفصیلات کے لئے آپ کسی دن صبح کو ۱۰ اور ۱۲ بجے کے درمیان خود اس دفتر میں تشریف لا کر متعلقہ کلرک سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

(دستخط) بابایو امرتی
ڈیویژنل افسر

صفحہ (۱۳)

موضع کپانچے
ضلع باساکوسو
کپانچے ۸- ستمبر ۱۹۶۳ء

بخدمت جناب ڈویژنل افسر صاحب بہادر
اگالا ڈویژن

ایک درخواست

جناب والا

عرضداشت سے پیشتر میں موضع کپانچے کے جملہ ساکنان کی جانب سے آپکی خدمت عالیہ میں آداب خادمانہ پیش کرتا ہوں اور ہم سب امید رکھتے ہیں کہ آپ اور آپکی بیویاں اور بچے خیریت سے ہوں گے اور علاقے میں امن و امان ہوگا جسکی آپ سے ہمیشہ توقع رکھی جاتی ہے اور جس کے لئے ہماری حکومت نے آپکو وہاں متعین کیا ہے۔

درخواست سے پیشتر یہ عرض کرنا بھی نہایت ضروری ہے کہ ان اطراف میں ہر لحاظ سے امن اور سکون ہے اور یہاں کے آزاد باشندے آپ کے انتظام سے قطعاً مطمئن ہیں۔

اسکے بعد جیسا کہ آپ جانتے ہیں دریائے بینوئے ہمارے علاقے کو چھوتا ہوا بہتا ہے اور یہاں کی معیشت کا دارومدار بہت کچھ دریا اور دریا کے سفر پر ہے۔ ہمارے یہاں پینٹھ ہر چوتھے روز لگتی ہے جس میں دریا پار سے بکثرت مرد عورتیں اور بچے شریک

ہوتے ہیں۔ اُسی طرح دریا پار کے گاؤوں کی پینٹھوں اور ہاٹوں میں سامان بیچنے کے لئے ہماری مائیں اور باپ اور دیگر آزاد باشندے تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز کشتی کا سفر کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے باساکوسو کے اکثر باشندے ماہی گیری بھی کرتے ہیں اور ان کی راتیں اور دن دریا پر بسر ہوتے ہیں۔

غرضکہ ہمارے علاقے کے لوگوں کی گذر بسر بہت کچھ دریا کے رحم اور کرم پر ہے اور ابھی تھوڑے عرصہ تک اس میں شکایت کی جا نہ تھی لیکن اب کچھ دنوں سے یہاں ایک عجیب بلائے ناگہانی دریا میں نمودار ہوئی ہے جس سے بچنے کا ہم میں یارہ نہیں اور جس کے ہوتے ہوئے دریا کا سفر ناممکن ہے۔

سب سے پہلے یہ بلا ایک ماہی گیر معلم (*) احمدو انکپا نے دیکھی تھی جو پو پھٹے اپنی کینوٗ میں کھڑا ہو کر جال پانی میں پھینک رہا تھا۔ اس کے سامنے کوئی اژدھے کے قسم کی چیز پانی سے اُبھری اور چیخ مار کر دوبارہ پانی میں چھپ گئی۔ جُثہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے ابھرنے اور ڈوبنے سے جو حرکت پانی میں ہوئی وہ جوار بھاٹے کے تناسب کی تھی اور ماہی گیر کی کینوٗ ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ پہلے تو معلم احمدو سمجھا کوئی بڑا گھڑیال ہے جو اس کی طرف لپک رہا ہے لیکن بلا کی دُم دیکھ کر اُسے یہ خیال تبدیل کرنا پڑا اور چونکہ وہ اس نوعیت کی مخلوق سے پہلے آشنا نہ تھا اس لئے اُس نے وہاں سے بھاگنے ہی میں خیریت سمجھی اور کسی طور کنارے تک پہنچ کر کنوٗ کو بغیر باندھے گھر کی

---

* معلم: مسلمان مردوں کو بالعلوم اسی لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔
تلفظ: مالم۔ رتبے میں 'الحاجی' سے کم۔

جانب دوڑا۔ بعد میں وہ کئی دن تک بخار کا شکار رہا جو یقیناً دہشت کا نتیجہ تھا۔

اس کے بعد سے اس بلا کو جسے اسکول ماسٹر نے ہمیں بتایا مینیٹی (م ی ن ی ٹ ی) * کہتے ہیں اور بہت سے آدمیوں نے دیکھا ہے۔ ایک موقعہ پر اس نے مسافروں سے بھری ہوئی ایک کشتی کا پیچھا بھی کیا تھا لیکن خوش قسمتی سے کنارہ نزدیک تھا اور ملاحوں نے فوراً کشتی کا رخ موڑ دیا۔ کنارہ پاتے ہی مسافر جھاڑیوں میں چھپ گئے اور بلا کچھ دیر آس پاس منڈلا کر دوبارہ پانی میں غوطہ مار گئی۔

یہ مینیٹی کینوؤ اور کشتیوں کا پیچھا اتنی مرتبہ کر چکی ہے کہ اب رات تو رات دن میں لوگ دریا کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے ہیں اور ہماری پینٹھ میں دریا پار سے شریک ہونے کے لئے بمشکل دس بیس نفر آ پاتے ہیں اور وہ سر شام واپس جانے کی سوچتے ہیں۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کھانے کی چیزیں عنقا ہوگئی ہیں اور تازہ مچھلی نایاب ہے۔

یہاں تک پھر بھی خطرے کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ کسی قسم کی خونی واردات نہیں ہوئی تھی لیکن پچھلے جمعہ کو مقامی ڈسپنسری اٹینڈینٹ کا ۲۰ سالہ لڑکا جوزف دریا کے کنارے اُگے ہوئے ایک درخت پر کسی کام سے چڑھا اور پیر پھسل جانے سے دریا میں جا پڑا تب سے اسکی کوئی اطلاع نہیں ہے اور نہ ہی کسی نے اسکی لاش کو پانی سے اُبھرتے دیکھا۔ چونکہ جوزف اچھا تیراک تھا اور کپاچے کے آس پاس دریا میں دوسرے گوشت خور

---

* ایک دودھ پلانے والا پانی کا جانور

جانور بھی نہیں ہیں اس لئے خیال کیا جا رہا ہے کہ سینٹی نے اسے درخت پر چڑھتے دیکھ لیا تھا اور وہ کنارے کے پاس پانی میں چھپی بیٹھی تھی اور بالآخر اسی نے جوزف کو ٹھکانے لگایا۔

ہم باشندگان موضع کپانجے ضلع باسا کوسو جو آپکی کرم گستری کے پہلے سے معترف ہیں آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں جلد از جلد اس بلائے ناگہانی سے نجات دلائی جائے اور دریا کو اس نحوست سے پاک کرنے کے بعد مرحوم جوزف کی لاش بھی غوطہ خوروں کے ذریعے ڈھنڈوائی جائے تاکہ ایکبار پھر ہم امن اور یکسوئی سے اپنے اپنے کام پر جانے لگیں۔

ہم ہیں آپ کے تابع فرمان

(کچھ دستخطیں اور چند دہقانی انگوٹھوں کے نشان)

صفحہ (۱۴)

بنام ڈویژنل افسر صاحب بہادر
اگالا ڈویژن

معرفت دیہی ڈسپنسری
اوجیاٹاگا، اوجیاپاٹا
اومیانی
اگالا ڈویژن
۱۰ نومبر ۱۹۶۴ء

ایک درخواست

جناب والا۔

ہم اومیانی کے آزاد باشندے آپکو ہدیہ سلام پیش کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ حضور مع اہلیہ، جملہ اہل خانہ اور دیگر احباب کے بخیر و عافیت ہونگے اور علاقے میں امن و امان ہوگا۔ یہ بات ہمیشہ ہمارے لئے باعث سکون رہی ہے کہ اب جبکہ انگریز ہمارے آزاد ملک سے جا چکے ہیں خود ہمارے ہی علاقے کا ایک نوجوان ہمارا ڈویژنل افسر ہے جس سے بجا طور سے بہتری کی توقعات وابستہ رکھی جا سکتی ہیں اور جو دن رات ہماری بہبودی کے لئے کوشاں ہے۔

خود ان اطراف میں مکمل امن ہے کسی قسم کی چوری چکاری، خون و قتل و غارت کی واردات عرصہ سے سننے میں نہیں آئی اور نہ ہی ہمارے ابا لوگ سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ یہ علاقہ بدنام سیاست دانوں کی آماجگاہ بنے اور وہ لوگوں کو ہنگاموں پر اکسائیں۔

تاہم یہ کہنے میں کچھ مضائقہ نہ ہوگا کہ جس طرح مکھی

کے دانوں میں کبھی کبھی ایک آدھ کنکر مل جاتا ہے جس سے آٹے کا لطف وقتی طور سے جاتا رہتا ہے ہمارا سکون بھی فی الوقت مکمل نہیں اور اُس میں شامل کوئی چیز دانتوں تلے ,کر ,کر پیدا کر رہی ہے۔ یہ چیز ہے علاقے کے جنگلی سؤروں کا آزار۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ آپ کا یہاں آنا جولیس سیزر کا آنا ہے اور آپ کے سامنے سکون برہم کرنے والی کوئی فوج دوگھڑی نہیں ٹھہرسکتی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ نپولین بوناپارٹ سے مشابہت رکھتے ہیں جسکا جذبۂ انتقام ہر دشمن کو دیکھ کر بھڑک اٹھتا تھا اور آپ اُسی کی طرح اپنے ارادوں پر قادر ہیں۔

اوجیاٹاگا، اوجیاپاٹا کے بیشتر باشندے جیسا کہ آپکو علم ہوگا مسلمان ہیں اور سؤروں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اس لئے یہ ملعون پچھلے چند سالوں میں اتنے بڑھ گئے ہیں کہ یام (*) کے جس کھیت میں گھس جاتے ہیں اسکا وہیں کھلیان ہوجاتا ہے اور مکئی کے تو اتنے دشمن ہیں کہ جہاں پہلے کھڑے کھیت لہلہاتے تھے اب ڈنٹھلوں کے انبار ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے خوف سے بندر، سانپ اور چوہے تک یہ علاقہ خالی کر گئے ہیں اور یہ مردود ہیں کہ ان میں سے ایک ایک ہاتھی کا جثہ رکھتا ہے۔ جدھر یہ موذی نکل جاتے ہیں رونے پیٹنے کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں اور ڈر ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں یہاں قحط نہ پڑ جائے۔

ہمارے یہاں بندوق رکھنے والا کوئی نہیں۔ دو بالوں نے ایک پندھرواڑہ ہوا تیر کمانوں کے بوتے ہر ہمیں ان موذیوں سے

---

* یام: ایک آلو سے بڑی جڑ جو بطور خوراک استعمال کی جاتی ہے

نجات دلانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ رات کو جب معمول کے مطابق سؤروں نے ایک گنی کورن کے کھیت پر دھاوا بولا تو ان دونوں نے جو پہلے سے ایک درخت پر چھپے بیٹھے تھے ایک موٹے جانور کو نشانہ بنایا اور پیہم تیر مارے۔ لیکن ایسا لگتا تھا اس جانور کی کھال ربڑ کی بنی ہوئی ہے جس پر تیر بے اثر تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جانور تو مرا نہیں سؤروں نے درخت کو گھیرے میں لے لیا اور گھنٹوں محاصرہ کئے رہے۔ اگلے دن کہیں درخت سے اترنا نصیب ہوا۔

تب سے ہمارے بھائی اور باپ ان جانوروں سے ٹکر لیتے ہوئے گھبراتے ہیں اور آپ سے ملتجی ہیں کہ ہمیں جلد از جلد ان موذیوں سے نجات دلائی جائے۔

ہم یقین دلاتے ہیں اگر چند یوروپین شکاری یہاں دو ایک دن کے لیئے بھیج دیئے جائیں تو وہ اتنا گوشت اپنے ہمراہ لے جا پائیں گے جو ہفتہ دس دن کو انہیں کافی ہوگا اور ہم بھی اطمینان کی نیند سو سکیں گے۔ ایک بار پھر آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ معاملہ عجلت طلب ہے اور بن کچھ کئے کچھ بن نہ سکے گا۔

ہم ہیں آپکی رعایا

دستخط معلم یعقوبو (اونو)*، معلم ابراہیم ڈمباٹا (سڈاکی)* معلم مجن یوا زاریا (ڈسپینسری اسسٹنٹ)، اور چند انگوٹھوں کے نشان

* شمالی نائیجیریا کے بعض علاقوں میں گاؤوں اور قصبوں کے مکھی یا عہدے دار

صفحہ (۱۵)

دفتر ڈویژنل افسر
اکالا ڈویژن
حوالہ ج۔ا۔گ/۲۱۴۔ س، ۲۲ جلد ۳
۱۵ نومبر ۱۹۶۴ء

بنام عالیجناب اونو آف کپانچے
ضلع کپانچے — باساکوسو

درپائے بینوئے میں سینیٹی

آپ لوگوں کی مشترکہ درخواست نوشتہ ۸۔ ستمبر ۱۹۶۴ء کا شکریہ جس میں میری توجہہ دریائے بینوئے میں سینیٹی کی موجودگی کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔

اس باب میں باساکوسو کے باشندوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ درخواست ملتے ہی دریائی پولیس کی ایک کشتی متعلقہ علاقے میں تعینات کی گئی تھی جس نے متعدد بار دریا کا سفر شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی جانب کیا لیکن باوجود سعئی بسیار کے دریائے بینوئے میں سینیٹی کی موجودگی کی تصدیق نہیں کی جاسکی۔

اگر یہ فتنہ دوبارہ سر اٹھائے تو میں آپکو یقین دلاتا ہوں میرا محکمہ ہر وہ کارروائی عمل میں لائے گا جسکی ضرورت ہوگی۔ بشرطیکہ آپ عینی شہادت کی بنیاد پر مجھے بسرعت مطلع کریں۔

(دستخط) بابایو امرتی
ڈویژنل افسر

صفحہ (۱۶)

از طرف مسٹر او۔ اوسیریکیے
ایڈورو
اگالا ڈویژن
۱۱ جنوری ۱۹۶۵ء

بنام ڈویژنل افسر صاحب بہادر
اگالا ڈویژن

جناب والا

عرض حال ہے کہ ان اطراف میں ہر چند کہ ہر طرح سے امن و امان ہے لیکن میں ایڈورو کے آزاد باشندوں کی جانب سے یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ ہماری راتوں کی نیند اور دن کا سکون ایک ایسے غنیم نے چھین لیا ہے جسکی سمجھ میں نہیں آتا کیا تعریف کی جائے اور جس کے لئے کونسا خطاب مناسب ہوگا۔ یہ غنیم شیر کی قامت کا نہیں لیکن شیر سے قوت میں سوا ہے۔ لومڑی نہیں لیکن لومڑی سے مکر و فریب میں بازی لے گیا ہے۔ چار ہاتھ پاؤں کا ہے لیکن پیڑ پر اژگر کی طرح چڑھتا ہے اور جس کے چھل بٹے سے ہوا، زمین اور پانی میں کہیں جائے مفر نہیں۔ غرضکہ ہر طرف ہا ہاکار ہے۔ مائیں روتی ہیں کہ چولہوں پر سے پکتی ہانڈیاں غائب ہوجاتی ہیں اور ہمارے باپ اور بھائی چلاتے ہیں کہ کھیتوں میں نہ یام بچتے ہیں نہ مکئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ غنیم بچوں کے ہاتھ سے بھٹے اور گنے چھین کر لے جانے میں بھی دریغ نہیں کرتا اور اس کے لئے ہر چیز روا ہے۔

اکثر ہم سو رہے ہوتے ہیں جب یہ موذی روزن میں سے ہاتھ اندر ڈال کر کھڑکی کی چٹخنی کھول لیتا ہے اور بے جھجکے ہماری جھونپڑی میں داخل ہوکر جو کچھ ملے چٹ کر جاتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب ہمیں دن میں بھی کھانا کمرہ بند ہوکر کھانا پڑتا ہے نہیں تو یہ موذی اس میں بے محابا برابر کا شریک ہوتا ہے اور بچوں اور بڑوں سب کے آگے سے چاول اور بیج چن چن کر اپنے گالوں میں بھر لیتا ہے اور جو کوئی ڈرائے تو اُسے نوچ لینے سے دریغ نہیں کرتا۔

آپ سمجھے یہ غنیم کون ہے؟ یہ غنیم ہے اس علاقے کا بیبون، جو ایک دو نہیں اب ہزاروں کی تعداد کو پہنچ گئے ہیں اور ایڈورو جن کی تاراجگاہ بنا ہوا ہے۔ رات کو جس درخت کے نیچے سے گذرا جائے ان کمینے بندروں کی چٹ چٹ سے جنگل گونج رہا ہوتا ہے اور قہر یہ ہے کہ ان موذیوں کو پیلا بخار (*) یا کوئی اور مرض بھی تو لاحق نہیں ہوتا جو ان میں مری پڑے اور ہمیں ان سے چھٹکارا ہو۔

اس علاقے کے امن پسند لوگ بندوقوں اور تیر کمانوں سے عاری ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ ہمارے یہاں جی داروں کی کمی نہیں۔ چنانچہ معلم ھمزہ نے جو پہلی جنگ عظیم کے آزمودہ کار سپاہی ہیں چند ماہ ہوئے اس علاقے کو بندروں سے خالی کرانے کی ٹھانی تھی۔ ایک شام معلم ھمزہ اپنی توڑے دار بندوق اور اپنے نواسے کو لیکر جنگل کی جانب چل پڑے۔ نواسہ اس لئے ساتھ تھا کہ معلم کی نگاہ کمزور ہے اور وہ شست باندھنے

---

* Yellow fever

میں ان کی مدد کرتا۔ ایک جگہ ایک درخت پر بیوؤں کا جم غفیر دیکھ کر معلم ہمزہ نے نشانہ لگانے کا ارادہ کیا اور نواسے کی اعانت سے پہلا فائر کیا۔ یکلخت جنگل پر خاموشی طاری ہوگئی۔ لیکن چونکہ درخت سے کسی جانور کے گرنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی اس لئے معلم نے سمجھ لیا کہ وار خالی گیا اور وہ بسرعت تمام دوبارہ بندوق کی نالی کو بارود اور شیشے کے ٹکڑوں سے بھرنے لگے۔
تب ہی ایکبارگی انہیں ایسا لگا کہ کسی نے دوزخ کے دروازے وا کر دیئے ہیں اور بندروں کے شور سے از ماہ تا ماہی ایک ہوا۔ اس کے بعد کی صحیح روئیداد کون سنا سکتا ہے کیونکہ نواسا بھاگ کر پاس کی ندی میں کود پڑا تھا اور جب معلم ہمزہ کراہتے ہوئے زمین سے اٹھے تو انہیں بندوق کے چھن جانے کا احساس ہوا جو سب سے قوی الجثہ بیوؤں کا سردار ان کے ہاتھ سے لے گیا تھا۔

اس درخواست کی محرک یہی واردات ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ ایک مصروف آدمی ہیں اور جو کچھ آپ ہمارے لئے کر رہے ہیں اس سے زیادہ کے طالب ہونے کا ہمیں حق نہیں تاہم ان حالات کے پیش نظر بن التجا کئے بھی نہیں رہا جاتا۔

ہماری درخواست ہے کہ ازرہ غریب پروری آپ ہفتہ عشرہ کو دو ایک شکاری جو یہاں تعینات کریں تو یہ بلا دفع ہو سکتی ہے اور ہم سکون کا سانس لے پائیں گے۔

(دستخط) مسٹر اوت اوسمز یکیے
رٹائیرڈ اسکول ٹیچر
ایڈورو۔ اکالا ڈویژن

مسٹر موسیا بسی
(*) سابن گاری
انکہا ہاؤساوا
انکہا۔ براستہ ایانگیا
۲۸۔ فروری ۱۹۶۵ء

بنام معلم بابابو امرتی
ڈویژنل افسر صاحب بہادر
اکالا ڈویژن

جناب والا

بے شک آسمان نے آپکی بیتے سال کی رضاکارانہ مدد کو جو مجھے آپ سے پہنچی تھی اپنی خوشنودی کے تاج سے نوازا ہے۔ چونکہ میں زندگی کی آخری منزل پر ہوں اس لئے ایسی بہت سی باتیں جانتا ہوں جو موت سے دور والے نہیں جانتے اور جانتا ہوں خدا آپ پر مہربان ہے۔ یہ توصیف میرے جذبات کے اظہار کے لئے ناکافی ہے کیونکہ خدا کی تعریف کون کر سکتا ہے اور ان کی جن پر خدا کا سایہ ہے! آپنے میری مدد بغیر تانبے کی آدھی پینی مانگے کی تھی، یہ ایسی بات ہے جسکی مثال اکالا کیا اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی اور اس کے لئے خدا آپکو سب سے اونچے آسمان پر جگہ دے گا۔ میری دعا ہے خدا آپ کے خاندان

---

* سابن گاری اور ٹوڈن واڈا
شمالی نائیجیریا کے تقریباً ہر شہر کے دو علاقوں کے نام، جیسے صدر اور سول لائینز یا نیا شہر اور پرانا شہر۔

کی ایسی پرورش کرے جو سب کے لئے باعث رشک ہو اور خدا آپکی عمر اتنی دراز کرے کہ آپ اپنی نیکیوں کی کھیتی خود اپنے ہاتھ سے کاٹیں۔ آمین!

اب میں انتہائی ممنون ہونگا اگر آپ میری مندرجہ ذیل درخواست پر غور کر سکیں۔

انکپا ھاؤساوا کے شمال میں جیسا کہ سب جانتے ہیں دریا کے نزدیک عربی زبان کا ایک مدرسہ سالوں سے قائیم ہے جس میں ہمارے مسلمان بچے اسلامی تعلیم پاتے ہیں۔ یہ مدرسہ حکومت سے امداد پاتا ہے اور خود اس کے وقف کی زمین بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے جس میں یام، مکئی اور چاول کی کاشت ہوتی ہے اور آمدن معقول ہے۔ یہ کرم ہمارے علم دوست اور متدین وزیر اعلیٰ کی بخشائیش کا ہے۔

اگر آپکا آنا کبھی ان اطراف میں ہو تو میری گذارش ہے گھڑی بھر کو آپ میرے دروازے پر بھی آئیں۔ انکپا کے جملہ لوگ مجھے اور مجھ سے زیادہ میرے لڑکے کو جانتے ہیں جو آپ کو ایک اندھیرے رمبو (گول جھونپڑی) میں لیٹا ہوا ملے گا۔ ہو سکتا ہے جب آپ آویں تو وہ چادر اوڑھ کر سگریٹ پی رہا ہو اور چادر جلنے کے دھوئیں سے جھونپڑی اٹی ہوئی ہو۔

یا ہو سکتا ہے وہ خود سے انگریزی میں باتیں کر رہا ہو اور کبھی کبھی ایسا لگتا ہے وہ خدا سے لڑ رہا ہے۔

ایک مرتبہ جب چادر کے جلنے سے خود اسکا جسم جلنے لگا تو لڑکوں نے اُسے کہتے سنا تھا

”حرامزادہ جلا رہا ہے“

معلوم نہیں اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

میرا یہ لڑکا انتہائی پڑھا لکھا ہے اور سب کہتے ہیں اسی وجہہ سے پاگل ہے۔ آپکو یہ سن کر یقیناً افسوس ہوگا کہ اسکی بیوی بجائے اس بیماری میں اس کے کام آنے کے ایک ایسے شخص کے گھر رہنے چلی گئی ہے جس کی وجہہ سے اس کا شوہر پاگل ہوا ہے۔

لیکن یہ بات پرانی ہے اور میرا خیال ہے میرا لڑکا اب یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا دشمن کون ہے۔ جس مدرسے کا تذکرہ سطور بالا میں ہوا ہے اس میں میرا لڑکا کبھی مدرس ہوکر آیا تھا اور اس وقت ہم سب کو یقین تھا کہ وہ مدرسہ کی اور مدرسے کے ساتھ یہاں کے مسلمانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دے گا کیونکہ اس کا چلن ایسا ہی تھا اور ارادے بلند تھے۔ اس تعلیم پر اُسے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں ملازمت مل رہی تھی جو تنخواہ اور ترقی کے اعتبار سے عربی مدرسے کی ملازمت سے بدرجہا بہتر تھی لیکن اُس نے یہ ملازمت ٹھکرا دی اور مدرسے کی کمیٹی کے کہنے سے تھوڑی تنخواہ پر یہاں کام کرنے آ گیا۔

یہ کمیٹی کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔ سب اس کمیٹی سے ڈرتے ہیں اور اس کے ممبروں کے سامنے ادب سے دہرے ہو ہوجاتے ہیں۔ اگر میں اس کمیٹی کو جنگلی کتوں کے غول سے تشبیہہ دوں تو مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ انہی کی طرح یہ مدرسے کو نوچے کھا رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پل کر بھیڑیا ہوگیا ہے اور جب کسی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو پورا غول اس کی استعانت کو لپک پڑتا ہے۔ یہ لوگ ہر طرح مضبوط ہیں کیونکہ ان کے تانے چاچے قصبے کی مسجد سے لیکر صدر مقام کی سرکاری عمارتوں تک ہر جگہ بیٹھے ہیں۔ کیا ضلع کمیٹی کیا گاؤں کی پنچائیت ہر چیز

پر ان کا راج ہے اور جو ان کے خلاف بولتا ہے خود اپنے حق میں کانٹے بوتا ہے۔

اس غول کا سب سے طاقتور درندہ مدرسے کا مدرس اعلیٰ ہے۔ اس کی عمر کوئی نہیں جانتا۔ نہ کسی کو یہ معلوم ہے وہ کب اور کہاں سے یہاں آیا تھا۔ اس کی آنکھیں عقاب کی آنکھیں ہیں اور سونگھنے کی قوتِ گدھوں سے سوا۔ چالاکی میں وہ چیتے کو مات کرتا ہے اور پیٹ اس کا ہاتھی سے بڑا ہے جس میں مدرسے کے کھیتوں میں اُگے ہوئے یام اور بھٹے اور دھان برسوں سے غائب ہوتے رہے ہیں۔ اور دھیرے دھیرے اوقاف کی زمینیں بھی اسکی آنتوں کی بھول بھلیوں میں کھوتی جا رہی ہیں۔ مدرسے کے لڑکے اسکول کے اوقات میں اس کے ذاتی فارم (*) پر کام کرائے جاتے ہیں اور جب چھٹیوں کے بعد اپنے گھروں سے لوٹتے ہیں تو اس کے لئے مونگ پھلی، پام نٹس (**) اور چاول کے بوروں کی سوغاتیں لاتے ہیں۔ اس کے یہاں پلے ہوئے مینڈھوں کا کوئی شمار نہیں۔ مائیں اس کے دروازے پر صبح پام وائین (تاڑی) کے تونبے پہنچالے جاتی ہیں۔ وہ یہاں کا سردار نہیں لیکن ہر سردار سے زیادہ طاقتور ہے، بادشاہ نہیں لیکن فرعون سے بڑھ کر قاہر ہے۔

میری بہو جس کے لئے میرے لڑکے نے ۱۴ پونڈ اپنے سسر کو ادا کئے تھے آج اسی شخص کے گھر بیٹھی ہے اور میرا لڑکا یہ تک بھول چکا ہے کہ اس کی ملازمت کے آخری ۱۷ مہینوں

---

* فارم: کھیت

** پام نٹس: ایک طرح کا گری والا پھل جس سے کھانے کا تیل نکالا جاتا ہے۔

کی تنخواہ ابھی تک اسکول کمیٹی کے ذمے واجب الادا ہے۔

آج صبح کی بات ہے میں اپنے لڑکے کو بستر سے اٹھانے اس کی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ یہ وقت میرے لئے بڑا کٹھن ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ بستر کو خراب کر دیتا ہے اور جھونپڑی تعفن سے بھری ہوتی ہے۔ جب میں اُس پر جھکا تو میں نے دیکھا اُس کی بانہہ سے خون بہہ رہا ہے اور میرے دیکھتے دیکھتے ایک رکابی جتنا بڑا بچھو اس کے بستر سے بھاگ کر دیوار پر چڑھنے لگا۔ لیکن جس چیز پر مجھے تعجب ہوا وہ یہ تھی کہ میرا لڑکا ہنس رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا

”وزیر اعظم کی کوئی چٹھی آئی؟“

میں نے کہا ”نہیں“

اُسنے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر اُسنے پوچھا

”اور گرینڈ قاضی کی؟“

دوبارہ میں نے نہیں کہا

اُس پر اُسنے میری طرف پیٹھ کی اور دیوار کی طرف منہہ کر کے لیٹ گیا۔

جب میں وہاں کھڑا تھا تو مجھے بہت سی پچھلی باتیں یاد آئیں۔ صدر مدرس سے اس کی لڑائی، غبن کا الزام، غنڈوں کے ہاتھ سے پٹنا اور بے وجہہ حوالات۔ اُن سب کے مقابلے میں اس بچھو کے کاٹنے کی تکلیف کیا تھی؟ ایک ِکرک۔

تب میں نے آپ کو یہ خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ آپ سے یہ درخواست ہے کہ از راہ کرم مجھے اس

مدرس اعلیٰ کو گولی سے مارنے کا لائسینس مرحمت فرمایا جاوے۔ اس عرضداشت کے ساتھ ہی ایک گنی کا ایک پوسٹل آرڈر بھی ملفوف ہے جو مجھے امید ہے لائسینس کی قیمت ادا کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

جناب والا اگر آپنے اسی صدق دلی سے میری درخواست منظور کر لی جس سے یہ لکھی گئی ہے تو مجھ سے زیادہ مسرور آدمی شاید آپ کو ساری دنیا میں نظر نہ آئے۔ ایک خدا ترس آدمی کی حیثیت سے میرا ایمان ہے آپ ضرور میری مدد کریں گے۔

مخلص

مسٹر موسیٰ بسی
صابن گاری۔ انکپا ہاؤساوا
انکپا۔ براستہ ایانگبا
۲۸- فروری ۱۹۶۵ء

ڈیویژنل افسر کا حاشیہ:

اس خط کی ایک نقل فوراً صوبائی پولیس کے افسر اعلیٰ کے پاس جانی چاہیئے اور مجھے کارروائی اور تفتیش کے نتیجے سے مطلع رکھا جائے۔

(دستخط) بابایو امرتی
۳ مارچ ۱۹۶۵ء

ایک ہفتے بعد چیف کلرک کا حاشیہ:

مزید کارروائی غیر ضروری ہے کیونکہ تفتیش پر پتہ چلا کہ معلم موسیٰ بسی نے پہلی اور دوسری مارچ کی درمیانی شب کو اپنے گھر میں خودکشی کر لی تھی اور چونکہ اس کے گھر میں اس کے لڑکے کی دیکھ بھال کرنے والا دوسرا کوئی اور فرد نہ تھا اس لئے موخرالذکر کو پاگل خانے بھیجنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

(دستخط) اوچ اوڈانگ

* * *

کھڑکی کے نیچے نائیجر بہہ رہا تھا۔ بہہ کیا رہا تھا ایسا لگتا تھا میلوں لمبا کفن زمین پر پھیلا ہوا ہے کیونکہ اس میں نہ لہروں کے ٹکرانے کی آواز تھی نہ تموج کا نشان۔

دریا کے دوسری طرف پام کے اونچے درختوں کا جنگل تھا جس میں سے کچی شراب کے تونبے بھرکے لوگ چھوٹی سیاہ کشتیوں میں سوار ہو رہے تھے۔

سورج کی ترچھی کرنیں دریا کی سطح پر پڑ رہی تھیں اور ان میں سے چند کھڑکی میں سے ہوکر ڈاکٹر کی میز سے ٹکرا رہی تھیں۔

لئے ڈویژنل آفیسر نے شعاعوں میں اڑتے ہوئے ذروں کو دیکھا، دریا پر پھیلی ہوئی چمک اور پار کے لوگوں کو کشتیوں سے چڑھتے اترتے دیکھا اور ایک بار پھر فائل کے ورق اپنی سیاہ انگلیوں سے الٹنے لگا۔

فائل نمبر ۷/جنگلات۔ جلد ۳

ماہنامہ افکار، کراچی۔ جنوری۔ فروری
(سالنامہ) ۱۹۶۸ء
۱۹۸-۱۹۷/۲۳، ۱۶۵ تا ۱۸۲

رمسرنا

دوپہر کا وہ وقت تھا جب بھکاری ایک چٹکی آٹا مانگنے آتے ہیں۔

وہی آواز باہر گلیارے میں گونجی۔ دھوپ سخت تھی، ہوا نم اور بوجھل اور گردن کے پیچھے اور بغلوں میں پسینہ کاٹ رہا تھا۔ بھکاری ۱۲،۱۳ سال کا لڑکا تھا۔ اُسنے دروازے کا ٹاٹ اٹھاکر اندر جھانکا اور جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

آٹا گوندھنے والی لڑکی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی تھی اور پیڑھی پر بیٹھی ہوئی اچھی لگ رہی تھی۔ لڑکا گہری سیاہ رنگت کا تھا، اس کے گھٹنے گھس گھسا کر سفید ہوگئے تھے اور ہانڈی جیسے سر پر ایک چرکی باقی بالوں کے اوپر اٹھی

نظر آ رہی تھی جس طرح گھاس میں سے ککرمتے کی چھتری دکھائی دیتی ہے۔

لڑکا کئی دن سے اس دروازے پر آ رہا تھا۔ پہلے اُسے ڈانٹ کر بھگا دیا جاتا تھا، اب کئی دن سے دھیلا پیسہ مل رہا تھا، اور آج باوجود دو تین منٹ گذر جانے کے کسی نے اس کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔

اُسنے اپنا سوال پھر دیواروں سے کہا۔

اندر سے کسی عورت نے پوچھا ”کون ہے؟“

گوری لڑکی نے کہا ”لڑکا“

”پوچھو مسلمان ہوتا ہے!“

”مسلمان ہوگا رے؟“

کالے لڑکے نے اُس کے چہرے کو تعجب سے دیکھا اور بغیر جواب دیئے چل کھڑا ہوا۔

شہر دور تھا، اور اسے آج کی کمائی کے لئے اب اپنے پر توڑنے ہوں گے۔ یہ گھر گاؤں سے شہر کے ہاٹ جاتے میں آدھے راستے پر پڑتا تھا اور یہاں سے کما کر لے جانا آسان ہوتا۔ لیکن بھیک کے لئے کوئی لڑا نہیں کرتا۔

اپنے راستے پر ہوکر اس نے سوچا ”یہ لوگ کس پرکار کے ہیں اور بھیک اور دھرم میں کیا سمبندھ ہے؟“

ایسا لگتا تھا دھرم چھوڑنے کے سوال میں بچھو کے کانٹے کی ٹپکن تھی۔

جب لڑکا شہر کی اور جا رہا تھا گھر کے بچے اپنے کھیل سے نمٹ کر گھر میں گھسے۔ وہ سال گاڑیوں کے ڈبوں میں ہاتھوں

کو گنے لادتے دیکھ کر آ رہے تھے۔ ہاتھی راجہ کے تھے جس طرح پلیٹ فارم راجہ کا تھا، اور سرخ بجری کے اس پلیٹ فارم کے دونوں سروں پر پتھر کی سلوں پر راجہ کا نام کھدا ہوا تھا۔ یہ اسٹیشن اُس راجہ کا پور تھا۔ جیسے ہستناپور۔ لیکن ہستناپور کا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ یہ واقعہ اتنا پرانا نہیں اور اُس زمانے میں لوگ ایک دوسرے کا مذہب نہیں بدلواتے تھے۔

وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے کیوں کہ ہاتھیوں کا کھیل ابھی جاری تھا اور رگھو نے کہا تھا وہ بڑے بابو کے گھر جانے پر انکی غیر حاضری میں بچوں کو سب سے بڑے ہاتھی کی پیٹھ پر بٹھائے گا۔

سب سے بڑا لڑکا جو ہفتہ بھر ہوا اسکول سے چھٹیوں میں گھر آیا تھا گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک خالی کوارٹر میں ایک ایسے کھیل میں مصروف تھا جس کا ذکر اس کہانی میں نہیں آنا چاہیئے، کیوں کہ ان کاغذات کے بچوں کے ہاتھ میں پڑ جانے کا خدشہ ہے۔ لیکن اسی کوارٹر میں ایک قصباتی لڑکی بھی گھسی ہوئی تھی جو اُسے دھمکیاں دے رہی تھی۔ اُس بڑے لڑکے نے اُسے ایک کنگورے دار چاندی کی چمکیلی چولی دی اور دونوں آگے پیچھے کوارٹر سے باہر نکل آئے۔

قصباتی لڑکی کی کھال تنی ہوئی چمکیلی سیاہ اور چکنی تھی۔ اُس نے لہنگے کو کس کر ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیا۔ کوارٹر سے نکل کر وہ ریل کی پٹری کی طرف گئی، ڈھال پر چڑھی، لائینوں اور تاروں کو پھلانگی اور پھر آہستہ آہستہ پار کے ڈھال سے نیچے اُتر گئی۔

بڑے لڑکے کے نتھنوں میں ابھی تک اس کے کپڑوں کے پسینے کی

بُو سمائی ہوئی تھی اور وہ اس کے بچھووں، کھنڈووں اور ہنسلی کی آوازوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اسے بھی بھوک لگ رہی تھی۔

جب سب کھانے پر بیٹھ چکے تو اسٹیشن ماسٹر بڑے بابو گھر میں داخل ہوئے۔ وہ موٹے تھے اور ہنستے میں ان کی توند پر قمیص پھدکتی تھی، جیسے اس میں مینڈک بند ہوں۔ جس کنبے کے سب افراد زندہ ہوں، بیٹیاں ابھی گھر میں ہی ہوں اور بیٹے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے ہوں وہاں کسے کھل کر بھوک نہیں لگتی! بڑے بابو کے گھر میں سب کے سب ڈیڑھ سیرے تھے۔

انہوں نے کھانے پر بیٹھتے ہوئے سنجھلی لڑکی کو پکارا۔

اندر چھوٹے کمرے میں جس کی پچھیت سے ریلوے لائن گذرتی تھی سنجھلی لڑکی کھڑکی کی سلاخیں پکڑے کھڑی تھی، اُس کی آنکھیں لائنوں کے ڈھال سے پار چلی گئی تھیں اور اپنے اندر وہ کسی زنانہ رسالے کے لئے بے معنی، پراسرار عبارتیں ڈھونڈ رہی تھی۔

ہر مہینے کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو یہ رسالہ ڈاک سے اُس پُور میں پہونچتا تھا۔ سب لوگ حتیٰ کہ بچے تک اُسے لینے کو لپکتے تھے۔ باہر کا بانس کا کاغذ جس پر اسٹیشن ماسٹر کا نام اور عہدہ چھپا ہوتا تھا احتیاط سے پھاڑ کر کتابوں کے ڈیسک میں رکھ دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ چھپا ہوا کاغذ بے احتیاطی سے کسی کتاب میں، یا کسی چیز پر لپٹ کر قصبے کے سامنے والوں کے گھر چلا جاتا تھا۔ لیکن عام طور سے اس سے کتابوں کی ملکیت ظاہر کرنے کا کام لیا جاتا تھا یعنی آنسہ یہ اور وہ۔ بنت یہ اور وہ۔ اسٹیشن ماسٹر فلاں پور۔

سنجھلی لڑکی کا چہرہ ستا ہوا چمپئی سفید تھا اور دو تین سال سے وہ برابر اس رسالے میں لکھ رہی تھی۔ وہ کیا لکھتی تھی یہ کسی کو پتہ نہیں تھا کیوں کہ اس کے لکھے میں قابل اعتراض یا قابل گرفت جذبات نہیں ہوتے تھے۔ لیکن ان قابل اعتراض جذبات کے بغیر بھی وہ اچھی طرح لکھ لیتی تھی، کیوں کہ اُس کے اچھے اور گرفت میں آنے والے تمام جذبات اپنی کسی فرضی سہیلی کے نام پر صرف ہوتے تھے۔ اور اب اس وقت بھی وہ کھڑکی پر کھڑی خوب صورت، پراسرار، بے معنی جملے اپنے ذہن میں درست کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا اُس سنسان اسٹیشن کے ماحول نے اُسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

اُس نے قصباتی لڑکی کو ڈھال چڑھ کر پار جاتے دیکھا، اپنے باپ کی آواز سنی اور صحن میں لوٹ آئی۔

بچے کھانا چھوڑ کر باہر لپکے کیوں کہ رگھو وہاں انتظار کر رہا تھا یا یہ کہ ہاتھی انتظار کر رہے تھے۔

بڑا لڑکا سنجھلا کہلاتا تھا۔ کسی کو اسکی وجہ نہیں معلوم تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ اُس سے اُوپر کا لڑکا یا تو گذر گیا ہے یا کھو گیا ہے۔ وہ اپنے باپ سے دور ہو کر بیٹھا اور دل میں ڈرتا رہا کہ چہرے کی رنگت یا کپڑوں کی بُو بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ اس کے برابر میں وہ لڑکا بیٹھا جو گیگلا تھا اور ہولو کہلاتا تھا۔

باپ کے پاس بڑی، منجھلی، سنجھلی لڑکیاں بیٹھیں۔ سالکن سب سے آخر میں کھانے پر آئی۔ وہ باورچی خانے میں کھانا نکلوا رہی تھی۔ اُس کے پیچھے چھوٹی لڑکی جو پھوہڑ سمجھی جاتی تھی

ڈھیلا پجامہ گھسیٹتی ہوئی آئی۔ وہ ضرورت سے زیادہ گندی تھی اور جانتی تھی باوجود ضروری ہوجانے کے نہیں نہائی ہے۔

بڑی، منجھلی، سنجھلی اور چھوٹی بہنیں ان ناموں سے کیوں پکاری جاتی تھیں جب کہ چھوٹی سے چھوٹی بہنیں بھی تھیں، — شاید اس لئے کہ چھوٹی کے بعد اور سب کی سب غیر متوقع تھیں۔

سب کھانے بیٹھ گئے۔ سب نے اُس چرکی والے لڑکے کا ذکر چھیڑا۔ چرکی والا لڑکا ابھی تک سوکھی کالی ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا شہر کے ہاٹ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جہاں اُسے اناج، پھل، دمڑی اور کوڑیاں مل جانے کی ٹوٹتی ہوئی آشا لئے جا رہی تھی۔

کنبے کی ماں کے پیٹ میں پھر بچہ تھا۔ اُس کی رنگت لڑکیوں کی رنگت تھی۔ لڑکے البتہ دھوپ میں پھر پھر کر جل گئے تھے۔

کنبے کی ماں نے پوچھا ”لونڈے کو کچھ دیا تھا؟“

”نہیں“ لڑکی نے کہا۔

”کیوں؟“

”وہ مسلمان ہونے کے نام پر چلتا بنا“

بڑے بابو نے محسوس کیا تنتنیا مرچ ان کے دانتوں میں کچل گئی ہے۔ ماں، لڑکیاں، لڑکے اور بڑے بابو سب چونک پڑے، کیوں کہ پچھلے تین دن سے یہی بات موضوع گفتگو تھی۔ چرکی والا لڑکا مسلمان ہوگا یا نہیں۔ یہ اتنا اہم مسئلہ تھا، کہ چھوٹے بڑے سب ہی کو اس میں دلچسپی تھی۔ ہولو تک کو، حالاں کہ چھوٹی لڑکی کا خیال تھا وہ نماز پڑھتے میں ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور جن کپڑوں سے کتے کے بچے کو گود میں لیتا ہے انہی سے نماز پڑھ ڈالتا ہے۔

ویسے مارے باندھے کی نماز پڑھنے کے سب ہی عادی تھے۔ چھوٹے بچے عید بقرعید کو بڑے بابو کے ساتھ عیدگاہ جاتے تھے۔ بڑے لڑکے جمعہ کی نماز پڑھنے کھدیڑ کر بھیجے جاتے تھے اور سب جانتے تھے کس کے دل میں کیا ہے۔ مثلاً منجھلے کو جو حقیقت میں سب سے بڑا لڑکا تھا، اور کوئی نہیں جانتا تھا وہ منجھلا کیوں کہلاتا ہے، اچھی طرح معلوم تھا کہ بڑے بابو کس قماش کے آدمی رہ چکے ہیں۔

برسوں پہلے وہ ان کے سنگ الہ آباد گیا تھا۔ باپ اور وہ ریلوے کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ صبح اُٹھ کر بڑے بابو اپنے کام سے کہیں چلے گئے تھے۔ اور وہ ریسٹ ہاؤس کے باغیچے میں لبولیاں بینتا رہا تھا۔

دوپہر کو بڑے بابو لوٹے اور اسے شہر گھمانے لے گئے۔ شہر بہت بڑا تھا۔ منجھلے کو اپنے باپ کے رویے میں راستے بھر ایک عجیب تبدیلی محسوس ہوتی رہی — ایسی تبدیلی جو بدمزاج باپوں کے لڑکے زندگی میں دو ایک بار ہی محسوس کرتے ہیں جب باپ یک لخت مہربان ہو جاتا ہے اور وہ ڈر ڈر کر اس کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال دونوں گھومتے رہے۔

بڑے بابو نے بہت سی چیزیں خریدیں۔ کچھ گراموفون ریکارڈ، تھرماس، کپڑے، منجھلی کے لئے رسالے اور بچوں کے لئے کھلونے۔

لیکن ان کھلونوں کے ساتھ بھی ایک عجیب یاد وابستہ تھی۔ دیوالی آنے والی تھی اور دوکانوں پر زیادہ تر مٹی اور مٹھائی کے کھلونے مل رہے تھے — آدمی جن کے سونڈیں تھیں اور عورتیں جن کے چھ چھ ہاتھ تھے، عجیب طرح کے لوگ جو ایسے جانوروں پر سوار

تھے جن کا جسم کتے کا تھا اور سر شہر کا — اور نیلے جسم والے انسان۔ بندروں کے ہاتھ میں گرز تھے اور بیل کھانڈ کے بنے ہوئے تھے۔

کھلونے خریدتے خریدتے بڑے بابو نے اپنی انگلی چھڑائی اور لڑکے سے وہیں ٹھہرنے کو کہہ کر ایک طرف چل کھڑے ہوئے۔ لڑکا کھلونوں میں الجھا ہوا تھا۔ ایک آنکھ سے وہ موروں کی قطار کو تک رہا تھا دوسری سے اس نے باپ کو سڑک کے پار جاتے دیکھا۔ پھر وہ اکڑ کے مکان کے زینے پر چڑھ گئے۔

تھوڑی دیر میں وہ کھلونوں سے اُکتا گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے جمائیاں لیں اور سڑک پار کرکے اُس مکان کے چھجے کے نیچے پہونچ گیا۔ ایک تمبولی نیچے کی دوکان میں پھرتی سے لکڑی کی ڈنڈیاں پانوں پر پھرا رہا تھا۔

لڑکے نے پوچھا ''اوپر کون رہتا ہے؟''

پنواڑی نے اُس کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھا اور دوبارہ پان پر سر جھکاتے ہوئے کہا

''کالی جان''۔

کسی مسلمان گھرانے کے بچوں کے لئے کالی جان نرالا نام ہوتا۔ لیکن کبھی بڑے بابو کے گھر میں ایک پٹھان لڑکی سرجان رہ چکی تھی۔ کالی جان بھی عورت ہو سکتی ہے وہ یہ بات سمجھ گیا، اور اسے بے وجہ اپنے سینے میں دل دھڑ دھڑ کرتا محسوس ہوا۔ بھاری بوجھل چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے جو زمین سے اُٹھنے سے انکار کر رہی تھیں اُس نے سڑک کو بھاگ کر پار کیا۔ ایک تانگہ اُس کے سر پر سے گذرا اور تانگے والے کا چابک اُس کے سر سے گذر

گیا۔ دل اور بھی زور زور سے دھڑکنے لگا، اور وہ پھر کھلونوں کی دوکان پر جا کھڑا ہوا۔

بڑے بابو کب آئے اور کب اُسے لے کر اسٹیشن پہونچے اُسے بمشکل یاد تھا۔

اُسے یاد تھا ماں نے دو ایک دن برداشت کرنے کے بعد کھلونے باہر پھکوا دئیے تھے جہاں سے جانکی کے لونڈے انہیں اُٹھا لے گئے تھے۔ کسی نے گیگلے لڑکے سے پوچھا تھا

"تم نے کھلونے کیوں باہر پھینک دئیے تھے؟ بالکل نئے تو تھے"۔ گیگلے لڑکے نے کہا "ہماری اماں کہتی ہیں وہ ہندوؤں کے مہادیو تھے"۔

کبھی کبھی لڑکیاں کسی پجاری کو پیپل کی جڑ میں رکھے ہوئے خوب صورت چکنے پتھر کو جھک کر پرنام کرتے دیکھتیں تو اُڑنگ مہاسنگ تڑنگ مہاسنگ کرنے لگتی تھیں۔

گھر میں کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا اور کرنے والے بہت زیادہ تھے۔ چار پانچ لڑکیاں، دو تین نوکر، رشتے کے کچھ لوگ جو ہمیشہ ڈھئیا دئیے رہتے تھے اور ماں، بڑی، منجھلی کاڑھ بُن سکتی تھیں اور سنجھلی کے پاس لکھنے کے لئے ہمیشہ وقت رہتا تھا۔

پھر چرکی والا لڑکا آیا۔

پہلے دن اُسے ڈانٹ کر بھگا دیا گیا تھا، کیوں کہ اس کے چرکی تھی۔ اگر وہ مسلمان ہوتا یا اُس کے چرکی نہ ہوتی، تو اسے پہلے دن ہی بھیک مل جاتی۔ ایک ہندو لڑکے کا مسلمان گھرانے سے بھیک لینے آنا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ نہیں جانتا

اس گھر میں کون رہتا ہے — یا پھر وہ اناڑی ہے، اور ہندو مسلم کے فرق کو نہیں پہچانتا۔

دوسرے دن بارش ہو رہی تھی، اتنی سخت کہ گلیارہ جوہڑ بن چکا تھا۔ وہ پانی سے بھیگا ہوا آیا اور ٹاٹ اٹھا کر چوکھٹ میں کھڑا ہوگیا۔ اس کے سر کے اوپر، دیوار کے اوپر، برگد کی ڈالی تھی، اور درخت کے پتوں میں بھیگے ہوئے کوے بیٹھے تھے۔ ایک لڑکی نے اُسے اندر آ جانے کو کہا۔

وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

لڑکی نے دوبارہ اُس سے اندر آ جانے کو کہا۔

مکان کے پیچھے ایک ٹرین گذری۔ اور کمرے کی کھڑکی کی جالیوں میں سے اُس نے دھندلی ھوا میں انجن کو آہستہ آہستہ گذرتے دیکھا، ایسا لگتا تھا انجن کانپ رہا ہے۔ دو لڑکے مال گاڑی کے ڈبے گننے لگے۔ چرکی والا لڑکا بھی آ کر برآمدے میں کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی مال گاڑی کے ڈبے گننے لگا۔

جب گاڑی گذر گئی، اور مال گاڑی کھڑکی کے سامنے سے گذرنے میں خاصی دیر لیتی ہے، تو اُس نے دھیلے کا سوال کیا۔ وہ ایک چٹکی آٹا لینے کو بھی تیار تھا۔

ایک عورت کمرے میں سے باہر آئی۔ اُس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ اور جس طرح گابھن بکریوں کا پیٹ چلتے میں ادھر اُدھر ہوتا ہے اُس کا پیٹ بھی جھول رہا تھا۔

”کون ہے یہ؟“

”بھکاری“ لڑکی نے کہا۔

”یہاں کیوں گھسا لیا اسے تم نے؟“ عورت نے خفگی سے پوچھا۔

لڑکا دوبارہ چوکھٹ پر جا کھڑا ہوا۔ اور وہیں کھڑا رہا۔ وہ ہاں یا نہ سننے کا منتظر تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک لڑکے نے اسے دھیلا لا کر دیا۔ اُسنے ''رام بھلی کریں'' کہا اور دروازے سے باہر نکلتے ہوئے گابھن عورت کو ''در۔ پھٹکار'' کہتے سنا۔

اگلے دن وہ پھر وہیں کھڑا تھا۔

عورت نے پوچھا

''کیا نام ہے تیرا؟''

چرکی والے لڑکے نے کہا ''رمسرنا''

بچے اُس کے نام پر ہنسنے لگے ''رمسرنا۔ رمسرنا''۔

چھوٹی بچی نے کہا ''واہ رمسرنا تو ہاتھیوں کا نام ہوتا ہے''۔

دوسری بچی نے کہا ''رمسرنا تو ہاتھیوں کا نام نہیں ہوتا''۔

رگھو کے ہاتھیوں کے نام تھے۔ جھبو، مستا اور تمبل۔ ہتھنی کا نام تھا چمپا اور دوسری ہتھنی تھی کشوری۔ پھر بھی بچے چرکی والے لڑکے کو رمسرنا ہاتھی پکارنے لگے۔ اور چھوٹی بچی کہتی تھی ''رمسرنا ہاتھی گندا ہے''۔

جب اُسے آٹا دیا جاتا تھا تو وہی بچی کہتی ''اب رمسرنا ہاتھی اپنا روٹ پکائیے گا''۔

رمسرنا کو بچے پسند آنے لگے۔ وہ دوپہر کو بھیک مانگنے آتا اور چوکھٹ پر کھڑا ہوکر ایک چٹکی آٹے کا سوال کرتا۔

بچے ہاتھیوں کو بٹھانے والی آواز میں کہتے ''دھت۔ دھت''۔

رمسرنا باری باری سے اپنے کمزور سفید گھٹنے زمین پر ٹیکتا اور

پھر اپنی دربل پچھاڑی زمین پر رکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں کے بل بیٹھ جاتا۔ اس طرح اس کا خیال تھا ہاتھی زمین پر بیٹھتے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ مکان کی چھت سے ٹرین گذرتے دیکھتا۔

اُس کے ایک چٹکی آٹے کے سوال پر ہولو آٹے کے ٹین میں سے ایک چٹکی آٹا اپنی دو انگلیوں میں دبا کر لاتا اور کہتا "اب رمسرنا ہاتھی آٹا کھائے گا اور دودھ دے گا"۔

ایک دن پھر وہ ایسے وقت آیا جب بارش ہو رہی تھی۔ گھر کی ماں نے خود اُس سے برآمدے میں آ جانے کو کہا۔ بچے اندر کمرے میں پلنگوں پر کود رہے تھے۔ بڑی لڑکیاں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، اور بڑے بابو، اسٹیشن ماسٹر، اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔

مالکن کے ہاتھ میں ترکاری کاٹنے کا چاقو تھا اور ایک انگوٹھے پر پٹی لپٹی ہوئی تھی۔

رمسرنا نے پوچھا "بھوجی انگوٹھا کٹ گیا کیا؟"

"ہاں کٹ گیا"۔

"رام رے رام" لڑکے نے سچ مچ تکلیف بھرے لہجے میں کہا۔ عورت کے دل میں ایک خیال آیا۔ رمسرنا 'یا اللہ' کیوں نہیں کہتا؟ یا کوئی اور بات کیوں نہیں کہتا؛ جیسے 'یا علی!' کہا لوگ کہتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد عورت نے پوچھا "تیرا کون گاؤں ہے رے؟"

"بھوج پور"

"بہت دور ہے؟"

"دھورے ہی ہے" لڑکے نے کہا۔

"ماں ہے؟"

"نہیں"۔

"باپ؟"

"نہیں" رمسرنا نے کہا۔

"اور کوئی ہے؟"

"کوئی نہیں بھوجی" رمسرنا نے مصنوعی رقت سے کہا۔ وہ اس حربے کو برسوں سے آزماتا آیا تھا۔ اور اس وقت بھی آشا کی کونپل اس کے من میں پھوٹ رہی تھی۔ بھوجی کے رحم کھانے پر آج کا دن تہوار بھی بن سکتا تھا۔

جب عورت نے اس سے گھر کا حال پوچھا، تو اُسے خیال آیا جو چند جملے بھیک مانگنے کے لئے رٹے تھے اس سے زیادہ خود اُسے بھی آگہی نہ تھی، یا ہو سکتا ہے اس سے زیادہ اس کی زندگی کی روئداد ہی نہ ہو۔

اس کی ماں پانچ چھ برس ہوئے مر چکی تھی اور جس طرح ان گنت جاتی عورتوں میں ہوتا ہے پھوٹ کھا کر دستوں اور قے سے مری تھی۔ لیکن باپ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اور کہاں گیا؟ یہ بھوج پور والوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔

لیکن سب سے اچرج کی چیز تھی اُس کی چرکی جو اُس کے سر پر سیاہ بھونرے کی طرح بیٹھی تھی۔ رمسرنا شاید یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا چرکی کب سے تھی اور آج تک کیوں وہ اُسے اپنے سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔

پھر اپنی دربل پچھاڑی زمین پر رکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں کے بل بیٹھ جاتا۔ اس طرح اس کا خیال تھا ہاتھی زمین پر بیٹھتے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ مکان کی چھت سے ٹرین گذرتے دیکھتا۔

اُس کے ایک چٹکی آٹے کے سوال پر ہولو آٹے کے ٹین میں سے ایک چٹکی آٹا اپنی دو انگلیوں میں دبا کر لاتا اور کہتا "اب رمسرنا ہاتھی آٹا کھائے گا اور دودھ دے گا"۔

ایک دن پھر وہ ایسے وقت آیا جب بارش ہو رہی تھی۔ گھر کی ماں نے خود اُس سے برآمدے میں آجانے کو کہا۔ بچے اندر کمرے میں پلنگوں پر کود رہے تھے۔ بڑی لڑکیاں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، اور بڑے بابو، اسٹیشن ماسٹر، اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔

مالکن کے ہاتھ میں ترکاری کاٹنے کا چاقو تھا اور ایک انگوٹھے پر پٹی لپٹی ہوئی تھی۔

رمسرنا نے پوچھا "بھوجی انگوٹھا کٹ گیا کیا؟"

"ہاں کٹ گیا"۔

"رام رے رام" لڑکے نے سچ مچ تکلیف بھرے لہجے میں کہا۔ عورت کے دل میں ایک خیال آیا۔ رمسرنا 'یا اللہ' کیوں نہیں کہتا؟ یا کوئی اور بات کیوں نہیں کہتا؛ جیسے 'یا علی!' کچھ لوگ کہتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد عورت نے پوچھا "تیرا کون گاؤں ہے رے؟"

"بھوج پور"

"بہت دور ہے؟"

"ادھورے ہی ہے" لڑکے نے کہا۔

"ماں ہے؟"

"نہیں"۔

"باپ؟"

"نہیں" رمسرنا نے کہا۔

"اور کوئی ہے؟"

"کوئی نہیں بھوجی" رمسرنا نے مصنوعی رقت سے کہا۔ وہ اس حربے کو برسوں سے آزماتا آیا تھا۔ اور اس وقت بھی آشا کی کونپل اس کے من میں پھوٹ رہی تھی۔ بھوجی کے رحم کھانے پر آج کا دن تہوار بھی بن سکتا تھا۔

جب عورت نے اس سے گھر کا حال پوچھا، تو اُسے خیال آیا جو چند جملے بھیک مانگنے کے لئے رٹے تھے اس سے زیادہ خود اُسے بھی آگہی نہ تھی، یا ہو سکتا ہے اس سے زیادہ اس کی زندگی کی روئداد ہی نہ ہو۔

اس کی ماں پانچ چھ برس ہوئے مر چکی تھی اور جس طرح ان نیچ جاتی عورتوں میں ہوتا ہے پھوٹ کھا کر دستوں اور قے سے مری تھی۔ لیکن باپ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اور کہاں گیا؟ یہ بھوج پور والوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔

لیکن سب سے اچرج کی چیز تھی اُس کی چرکی جو اُس کے سر پر سیاہ بھونرے کی طرح بیٹھی تھی۔ رمسرنا شاید یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا چرکی کب سے تھی اور آج تک کیوں وہ اُسے اپنے سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔

جب وہ مکئی کا آٹا لے کر چلا گیا تو گابھن عورت دیر تک بیٹھی اُس کے بارے میں سوچتی رہی۔
پورب کی طرف دیہاتوں میں کچھ لوگ تھے جو یہاں سے گئے تھے جو لوگوں کو کلمہ پڑھاتے تھے۔ اسے معلوم تھا، وہ لوگ تبلیغ کر رہے ہیں، اور وسسرلا کو دیکھ کر اس کے دل میں بھی کھد بد ہونے لگی۔ کیوں نہ تبلیغ کی جائے۔

اُس رات ان لوگوں نے کھل کر وسسرلا کے بارے میں بات کی۔

بڑے بابو دیر تک اورنگ زیب عالمگیر کا ذکر کرتے رہے اور سنجھلے لڑکے کو ایسا محسوس ہوا کہ خود وہ اورنگ زیب کا طرفدار ہے۔ بڑی لڑکیاں جو بڑی، سنجھلی اور سنجھلی اور چھوٹی کہلاتی تھیں وہ بھی جوش کے عالم میں بولتی رہیں۔ اس سنسان ہالٹ پر جہاں سے بہت سی گاڑیاں بے ٹھہرے اتنی تیزی سے گذر جاتی تھیں کہ گھر کانپنے لگتا تھا ایسا لگتا تھا آج ایک ڈاک گاڑی رک گئی ہے اور اُس کے رک جانے سے میلے کی سی فضا پیدا ہوگئی ہے۔

آہستہ آہستہ وسسرلا کی جگہ دوسری مذہبی باتوں نے لے لی۔ ندی کی سطح پر جانماز بچھا کر کون نماز پڑھا کرتا تھا اور کون ہوا میں معلق چادر پر نماز پڑھ سکتا تھا۔ اور جس طرح ہوتا آیا ہے ہر شخص نے ان باتوں سے موت کا خوف محسوس کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو کچھ اُس حالت میں پایا جو نصوح کے گھر والوں کی وباء کے بعد ہوئی تھی۔

ماں نے سویرے کی نماز پڑھی اور چھوٹی لڑکیاں جو قبر

کے عذاب سے کانپتی ہوئی سوئی تھیں قرآن پڑھنے بیٹھ گئیں۔ روشنی پھیلنے لگی۔

بڑے بابو دو ایک بار کام کے بیچ میں چونک پڑے۔ ان کے بڑے بھائی جو کہیں سول سرجن تھے اس مرتبے کو پہونچ چکے تھے کہ روحوں سے بات کر سکتے تھے۔ بڑے بابو نے پہلی بار اس فاصلے کو محسوس کیا جو ان کے اور بڑے بھائی کے درمیان زندگی کی مختلف لگنوں نے لا ڈالا تھا۔ وہ کیا تھے؟ زیادہ سے زیادہ پیٹ کے کتے۔ لیکن زندگی کا مقصد محض کمانا کھانا اور ٹانگیں پھیلا کر سو جانا ہی تو نہیں!

منجھلا لڑکا اُس دن کھویا کھویا سا رہا۔ اُسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب بارہ تیرہ سال کی عمر میں اسے کسی نے بیس پچیس برس کی سکھ دیا کے ساتھ پکڑا تھا۔ پکڑنے والی منجھلی بہن تھی جس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس واقعہ کی اطلاع ماں باپ کو کن الفاظ میں دی جائے۔ بالآخر اس نے ایک پرچہ گول مول الفاظ میں لکھ کر ماں کو دیا جسکا مطلب ماں کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ اس کے بعد سے آج تک نہ جانے کتنی سکھ دیاں تھوڑی دیر کا سکھ دے کر اس سے بچھڑ چکی تھیں۔ نہ اُس نے ان کے گم ہوجانے کو محسوس کیا تھا نہ ہی انہوں نے اُن لمحوں کو یاد رکھا ہوگا۔

اُس دن اور اُس کے اگلے دن وہ کھویا کھویا سا رہا، اپنی بہنوں کی طرح۔

دوپہر کو رسمونا پھر آیا۔ اُسی طرح چیتھڑے پہنے ہوئے۔ بچے اُسے دیکھ کر خاموش ہوگئے۔ ایک لڑکی اسے پیسہ دے کر

چلی گئی۔ سالکن ایک بار کمرے سے باہر نکلی، کچھ دیر برآمدے میں کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔ گھر سویا سویا سا لگ رہا تھا۔ مکان کی پشت پر بھی سناٹا تھا۔ بڑی لڑکی بے ضرورت سامنے آئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ دروازے پر کچھ دیر رک کر چرکی والا لڑکا لوٹ گیا۔

وہ سوچ رہا تھا، عجیب لوگ ہیں۔ آج دچھنا اچھی ملی تو کسی نے ٹھیک سے بات نہیں کی۔ بچے اُسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح کھل کیوں نہیں اُٹھے!

اُس کے جاتے ہی سویا ہوا گھر جاگ پڑا۔

گھر والی نے کہا ”چلا گیا؟ میں تو بات کرنے آہی رہی تھی“۔

بڑی لڑکی نے کہا ”واہ اماں تم کہاں بات کرتیں! تم تو اُسے دیکھ کر لوٹ آئی تھیں“۔

”تم بھی تو لوٹ آئی تھیں“ چھوٹی پھوہڑ لڑکی نے کہا۔

بڑے بابو جب کھانے کو آئے تو ان کا پہلا سوال تھا ”رمسرنا آیا تھا؟“

”یہاں آیا تھا؟“ کسی نے کہا۔

”پھر کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں“ سب بغلیں جھانکنے لگے۔

اُنہوں نے تعجب سے پوچھا ”کیوں؟“

”بھاگا کہاں جاتا ہے؟ کل دیکھا جائے گا؟“

لیکن اگلے دن رمسرنا مسلمان ہونے کے نام پر چل کھڑا ہوا۔ یہ ٹھیک تھا وہ غریب ہے لیکن درگتی میں کوئی دھرم چھوڑنے

پر تو راضی نہیں ہوجاتا۔ تو شاید اتنے دن سے یہ لوگ اسی لئے بھیک دے رہے تھے!۔ وہ راستہ چلتے میں کئی بار اتنا مدہم ہوا کہ لگتا تھا رک کر تناؤ پیچ کھا رہا ہے۔ پھر ہاٹ وقت سے پہونچنے کا خیال آتے ہی قدم تیز ہو جاتے تھے۔

راستے میں ایک ندی پڑتی تھی اس میں اسنے منہ دھویا، پیر دھوئے اور دوسرے کنارے پر نکل کر اُدھر اُگے ہوئے پیپل کی جڑ میں رکھے ہوئے پتھر کو پرنام کیا۔ اُس کے اندر بھی آج پہلی بار اپنے دھرم سے پیار پیدا ہوا تھا۔

لیکن جب وہ شہر پہونچا تو ہاٹ ٹوٹ رہا تھا، لوگ واپس جا رہے تھے، اور جو رک گئے تھے وہ دن بھر کی دھوپ سے بوکھلائے ہوئے تھے۔ اس رات وہ تقریباً خالی پیٹ سویا جس طرح اکثر بڑے بابو کے گھر جانے سے پہلے سویا کرتا تھا۔

اگلے دن وہ پھر ٹھیک وقت پر گلیارے میں کھڑا تھا۔

اسکی آواز سن کر بچے شور مچانے لگے ”رسسرنا ہاتھی آ گیا“۔

چھوٹی لڑکی نے اسے دھت دھت کہا اور چرکی والا لڑکا تھوڑی دیر شرمانے اور ہچکچانے کے بعد اپنی سوکھی ہوئی ٹانگیں ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

الکن نے شور مچاتے ہوئے بچوں سے کہا

”چپو۔ بات کرنے دو۔ رسسرنا کل بھاگ کیوں گیا تھا رے؟“۔

”کچھ نہیں بھوجی“ رسسرنا نے کہا

”کچھ کیوں نہیں، کل بنا پیسہ لئے نہیں چلا گیا تھا؟“

رسسرنا چپ بیٹھا رہا۔ دو بچے صحن میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بیٹھے

اُسے اس طرح تک رہے تھے جیسے اب وہ کوئی کرتب دکھانے والا ہے۔

”کل کچھ کھایا تھا؟“ مالکن نے پوچھا۔

”اماں شکل دیکھو۔ لقات لگ رہے ہیں“ بڑی لڑکی نے کہا۔

”کون ہے؟“ اندر سے منجھلی لڑکی کی آواز آئی۔

”باجی رسرنا ہاتھی آیا ہے“ بچوں نے کہا۔

”کیسا ہاتھی ہوتا ہے“ ماں نے ڈانٹ کر کہا ”آدمی کو ہاتھی گھوڑا کہتے ہیں! وہ بھی تمہاری طرح کا انسان ہے“۔

بچے سہم گئے۔

رسرنا رونے لگا — گاؤں میں کبھی کسی نے اسکی طرفداری نہیں کی تھی، بچے اُس کے ساتھ کھیل نہیں سکتے تھے اور ہر جگہ دُر دُر پھٹ پھٹ ہوتی تھی۔ اُسنے لوگوں کے مکان اندر سے نہیں دیکھے تھے۔ لوگوں کی رسوئیاں کیسی ہیں وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا اور یہ عورت اُس کے لئے اپنے بچوں کو ڈانٹ رہی تھی —!

گرم آنسو بہہ کر اسکی باچھوں میں آ گئے اور وہ انہیں چاٹ گیا۔

”روٹی کھائے گا؟“ عورت نے پوچھا۔

اُسنے اثبات میں سر ہلایا۔

ایک لڑکی روٹی لے آئی اور رسرنا بھوکوں کی طرح کھانے لگا۔

کھانے کے بیچ میں عورت نے کہا ”مسلمان ہو جا تو تجھے اچھے اچھے کپڑے دوں گی۔ بھیک مانگ کے کیا ملتا ہے! نہ گھر ہے نہ در۔ کوئی پوچھنے والا تک تو ہے نہیں۔ یہیں رہ۔ بچوں کے ساتھ کھیلا کر“۔

منجھلی لڑکی نے کہا ”میں تجھے پڑھایا بھی کروں گی۔ پڑھ لکھ کے کہیں بابو بن جائے گا“۔

رمسرنا سوچ میں پڑ گیا۔ لڑکیاں حقیقت میں اچھی تھیں اور بھوجی تو ماتا سمان تھیں۔ آج تک بھوک کے جو دن گذرے تھے، پوہ ماگھ کی سُو سُو کرتی ہوئی راتیں، اور لوگوں کا برتاوا جیسے وہ روگی اور اچھوت ہو۔ ان سب باتوں کا اس گھر میں گذر کہاں تھا۔ وہ چپکا بیٹھا سنتا رہا۔

”بول ہوگا مسلمان؟“ مالکن نے پھر سے پوچھا ”دونوں وقت کھانے کو ملے گا اور وہی جو ہم سب کھاتے ہیں، یہ نہیں کہ بھکاریوں کی طرح اٹھا کے روٹی پکڑا دی“۔

اب تک جو ہچر مچر تھی وہ ترغیب کے ریلے میں مٹی کے باندھ کی طرح بہہ گئی۔

اُس نے مرے ہوئے لہجے میں ”ہاں“ کہی۔

ایک لڑکا بھاگا ہوا اسٹیشن بڑے بابو کو بلانے گیا، اور وہ ہانپتے کانپتے گھر پہونچے۔

صحن میں ایک لڑکی نل چلا رہی تھی اور رمسرنا مل مل کر نہلایا جا رہا تھا۔ پانی پڑنے سے جہاں جہاں سے صابن دھل جاتا تھا اُسکا جسم نکھر آتا تھا۔ اور اُس وقت لگ رہا تھا وہ اتنا کالا نہیں ہے جتنا دھول نے اسے بنا رکھا تھا۔

اندر مالکن چھوٹے لڑکوں کے پرانے کپڑے ڈھونڈھ رہی تھی، اور برآمدے کے پلنگ پر پرانے کپڑوں کی لادی لگ گئی تھی۔

نل کی دھار چھوڑنے کو رمسرنا کا من ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس طرح تو اسے ماں نے بھی کبھی نہیں نہلایا تھا۔

"بس بس سردی لگ جائے گی" بڑے بابو نے کہا۔
ایک لڑکی بھاگ کر تولیہ لے آئی۔ تولیہ ہاتھ میں لے کر رمسرنا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اس موٹے روئیں دار کپڑے کا کیا کرے۔ تب کسی نے کہا
"رمسرنا ہاتھی جسم نہیں پونچھ رہا"۔
"ارے جسم پونچھ" مالکن نے کہا۔
رمسرنا اُسی طرح گم متھولا کھڑا رہا۔
"شریر! ارے شریر پونچھ" بڑے بابو نے کہا۔

رمسرنا شریر پونچھنے لگا۔ وہ اس وقت مداری کے بندر کی طرح تھا جو اشارے پر چلتا ہے، کبھی کبھی اُلٹی حرکت کر بیٹھتا ہے۔ اور ٹوکنے پر چپ کھڑا ہو جاتا ہے۔

مالکن سوچ رہی تھی اس خوشی میں ایک میلاد شریف بھی ہونا چاہیئے۔ اور بڑے بابو اس خیال میں مگن تھے کہ اس اطلاع کے جانے پر ان کے بڑے بھائی بھی چونک پڑیں گے۔

حالاں کہ منجھلے لڑکے نے رمسرنا کو مسلمان کرنے میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن اس کی طمانیت بھی اپنی جگہ مسلم تھی کیوں کہ وہ پچھلے چند دنوں سے برے کاموں سے بچ رہا تھا۔

آج اس گھر میں ناخوش کون تھا! جس کنبے کے سب افراد زندہ ہوں، بیٹیاں ابھی گھر ہی میں ہوں، بیٹے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے ہوں اور جس گھر کو دین کی سعادت نصیب ہو رہی ہو وہاں سوگ، کوئی کیوں مناتا!

رمسرنا کو ایک پجامہ دیا گیا کہ وہ آڑ میں ہو کر پہن

لے۔ پھر منجھلے نے وہیں لے جا کر اُسے قمیص دی۔ کسی چھوٹی لڑکی نے ایثار سے کام لے کر اُسے اپنی پرانی سیاہ جوتیاں پہنا دیں۔ اور جب اوٹ سے نکل کر رمسرلا باہر آیا تو مالکن نے کہا ”دیکھو اب کیسا میاں پوت لگ رہا ہے“۔

لڑکا برآمدے میں کھویا کھویا سا کھڑا تھا اُسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔ گھر کے تمام افراد کی طرح وہ بھی ہنگامے سے متاثر تھا۔ اس ہنگامے کے پیچھے جو فلسفہ ہو سکتا تھا اسے سب بھول چکے تھے۔

پھر مالکن اُسے ہاتھ پکڑ کر چوکی کے پاس لے گئی اور اسے چوکی پر بٹھایا جانے لگا۔ پھر کسی نے اُسے چوکی سے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور چھوٹی ایک جازم لے آئی جو چوکی پر بچھا دی گئی۔ رمسرلا پھر چوکی پر بٹھا دیا گیا۔

مالکن نے بڑے بابو سے کہا ”اب کرو مسلمان“۔

”اوں“ کرکے سوچتے ہوئے بڑے بابو آگے بڑھے اور پھر اس خیال سے کہ اب کیا کرنا چاہیئے پیچھے ہٹ گئے۔

”ارے کھڑے سوچ کیا رہے ہو؟“ کنبے کی ماں نے پوچھا۔

”تم ٹھیک کر رہی ہو۔ مجھے جو کرنا ہے کل کرادوں گا“ انہوں نے بیوی کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جیسے پہیلی بجھوا رہے ہوں۔

مالکن نے لڑکے سے کہا ”تو جی سے مسلمان ہوتا ہے نا؟“

رمسرلا گپت رہا۔

”بول۔ جی سے مسلمان ہو رہا ہے نا؟“ مالکن نے رمسرلا کا کندھا

ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا بھوجی؟" رمسرنا نے پوچھا۔

"میں پوچھ رہی ہوں مارے باندھے تو مسلمان نہیں ہو رہا ہے؟ دیکھ تجھے کوئی دھمکی نہیں دے رہا — گلا نہیں گھونٹ رہا — راضی خوشی مسلمان ہو رہا ہے۔"

"اپنی اچھا سے مسلمان ہو رہا ہے" بڑے بابو نے مالکن کے آخری جملے کے ساتھ ساتھ کہا۔

رمسرنا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر سے کہو" سب نے کہا۔

"بس تین دفعہ تو تم نے پوچھ لیا" بڑے بابو نے کہا۔

"آج سے تیرا نام خدا بخش ہے"۔

رمسرنا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ اس پر اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"بخشو کو کلمہ پڑھاؤ۔ بخشو پڑھو لا الہ" ایک لڑکی بولی۔

"لا الہ"

"إلا الله"

"ال۔ لل۔ لا"

"ایسے نہیں، پہلے بخشو کو ٹوپی پہناؤ" بڑے بابو نے کہا۔

"اور اسکی چرکی؟" ہولو نے کہا۔

ان الفاظ میں جادو تھا۔ سب سے پتے کی بات گیگلے لڑکے ہی نے کہی تھی۔

ایک لڑکی بھاگ کر بقچہ سے قینچی لے آئی اور منجھلا چرکی کاٹنے کے لئے آگے بڑھا، چرکی والے لڑکے نے دونوں ہاتھوں

سے کس کر اپنی چرکی دبالی جیسے وہی اسکی جمع جتھا تھی اور اس کے چلے جانے پر وہ لٹ جائے گا۔

"ارے چھوڑ۔ چرکی کاٹنے دے" منجھلے نے کہا۔

"نہیں نہیں، میں چرکی نہیں کٹواؤں گا" رمسرنا نے روتے ہوئے کہا۔

"ارے اسے کیا ہوگیا؟" مالکن نے کہا۔

رمسرنا کے سر پر چھینا جھپٹی ہو رہی تھی، اور وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔

مالکن نے کہنا شروع کیا "چرکی نہیں کٹے گی تو مسلمان کیسے ہوگا۔ بھک منگے کا بھک منگا ہی رہے گا"۔

"میں چرکی نہیں کٹواؤں گا" لڑکے نے کہا۔

"نہیں مانے گا تو؟" بڑے بابو ڈانٹ کر بولے۔

"میں نہیں کٹواؤں گا"

ایک سمے تک چرکی والے لڑکے کے سر پر، ہرلے مچا رہا۔ پھر کسی نے دھکا دے کر اسے چوکی سے نیچے اتار دیا۔

کسی نے کہا "نکل یہاں سے"

وہ مرے مرے قدموں سے نل کے سامنے سے گذرا جہاں اس کی پھٹی ہوئی قمیص پڑی تھی۔ دروازے پر بھولچ کر اس نے بھیک مانگنے کا برتن اٹھایا، اندر سے کسی نے کہا

"پکڑو اسے!"

رمسرنا کود کر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد سب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے مہت

میں سے آئے ہیں —

بڑے بابو اسٹیشن لوٹ گئے۔

بچے ریلوے لائن پر پتھر رکھنے چل کھڑے ہوئے۔

ہولو نے سگریٹ کی خالی ڈبیوں کا اپنا ذخیرہ نکالا اور گننے لگا۔

سنجھلی لڑکی نے دیکھا ریلوے لائن کی ڈھلان پر دور منجھلا چڑھ رہا تھا۔

اُسکا جی چاہ رہا تھا وہ اپنی پیاری سہیلی کے نام ایک خط چھپوائے جس میں یہاں کی تنہائی کا ذکر ہو اور خاموشی کا جو ریلوں اور لیڑووؤں کی آواز سے ٹوٹتی ہے اور پھر پانی کی سطح کی طرح پرسکون ہو جاتی ہے۔

چرکی والا لڑکا ایک پٹیا پر چلتا ہوا سوچ رہا تھا، اس کے سنگ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ اگر یہ کھیل تھا تو وہ بھاگ کیوں کھڑا ہوا ہے، اور اب کہاں جائے گا۔ اور اگر سچ مچ دھرم چھوڑنے کی بات تھی تو بڑی خیریت ہوئی کہ وہ بچ نکلا۔

گاؤں جانے کو اسکا جی نہیں چاہ رہا تھا، اسے کھیڑے اُس کے من کو بھا رہے تھے، اور نہانے کے بعد بھوک بھی لگنے لگی تھی۔

پٹیا کے دونوں طرف اُگے ہوئے پودوں میں اُسنے کوئی کھانے والی چیز ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن کچھ نہ پا کر شہر کی طرف چل پڑا۔

جب وہ شہر پہونچا تو سورج ڈوب رہا تھا۔ دو تین گھر جھانکتے جھانکتے اندھیرا ہونے لگا۔

اُسنے ایک چبوترے پر بیٹھ کر دونے کی چیزیں کھائیں جو کسی حلوائی نے دی تھیں، اور جن میں مٹھائی کا چورہ نمکین دہی میں مل گیا تھا، اور چونٹیوں کی ٹانگیں چورے کے ساتھ منہ میں چلی آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر میں آکاش سرخ ہوکر بجھ گیا۔ سامنے کے مندر سے سندھیا کے لئے آنے والے اپنے گھروں کو چلے گئے اور پجاری مندر کے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔

ہوا میں گھٹن تھی۔ پجاری مندر کے دروازے پر سیاہ مورتی کی طرح بیٹھا تھا۔

ایک پرندہ پر پھڑپھڑاتا ہوا سر پر سے گذرا۔

رمسرلا اُٹھ بیٹھا، اور تنہائی مٹانے کے لئے پجاری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آج کی بات کسی کو بتانے کے لئے وہ دوپہر سے بے کل ہو رہا تھا۔

پجاری نے سخت لہجے میں پوچھا ”کون ہے تو؟“

”مہراج میں رمسرلا ہوں“

”پھر؟“

”کچھ نہیں۔ بس ہاتھ جوڑنے آیا تھا“ رمسرلا نے کہا۔

پجاری خاموش بیٹھا رہا۔

”کہاں رہتا ہے؟“

”بھوج پور میں“

”بھیک مانگتا ہے؟“

”ہاں“۔

"ماں باپ نہیں ہیں؟"

"نہیں"۔

"بیٹھ جا"۔

رمسرنا بیٹھ گیا۔

"کون جات ہے؟"

رمسرنا چپ بیٹھا رہا۔

پجاری بھی چپ رہا۔

پھر رمسرنا نے بالوں کا گچھا اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا "ایک گھر رستے میں پڑتا ہے مہراج۔ مسلمانوں کا۔ وہ لوگ آج میری چرکی کاٹ رہے تھے"۔

"کون ہے وہ درآچاری؟" پجاری نے کہا۔

"بڑا بابو"۔

"تو لے کٹوالی؟"

"نہیں مہراج"۔

"اور کیا کہتے تھے؟" پجاری نے کہا۔

رمسرنا بولا "کہتے تھے مسلمان ہو جا۔ ہم گھر میں رکھیں گے، کپڑے دیں گے اور کھانا پیٹ بھر کے کھایا کیجئو"

کافی دیر تک وہ اپنی درگھٹنا سناتا رہا۔

پجاری بیچ بیچ میں "بدماس کہیں کے" کہتا جاتا تھا۔

جب رمسرنا کہہ چکا تو اُسنے اُسے اپنے پاس بلا کر اُس کی چرکی چھو کر دیکھی اور دیر تک رمسرنا کا ہاتھ پکڑے اسے سمجھاتا رہا۔ اُس کے نزدیک رمسرنا نے بہت بڑا کام کیا تھا، ایسا

کام جو بس اونچی جاتی والے کر سکتے ہیں۔ اُسنے کہا: کل وہ یہ کہانی سب کو سنائے گا کہ ایسے ایک بالک نے اپنے دھرم کی رکشا کی۔ اور پھر کوئی نہ کوئی اچھے گھرانے والا رمسرنا کو اپنے گھر میں رکھ لے گا۔

جب پیٹ بھر جانے پر رمسرنا مندر کے صحن میں گہری نیند سو رہا تھا اُسے کسی کی گرم سانس اپنے چہرے پر محسوس ہوئی۔ ایک دم گھبرا کر اُٹھ بیٹھنے کی کوشش میں اُسے ایسا لگا اُسکا کمزور جسم بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہے۔ اُسنے چیخنا چاہا، لیکن پجاری نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں میں جدوجہد ہوتی رہی جس کا نتیجہ رمسرنا کو اچھی طرح معلوم تھا کیا ہوگا۔ سڑک پر پھرنے والے ہر غریب لڑکے کی طرح زندگی کے بہت سے بھید وہ کم عمری کے باوجود جانتا تھا۔

بالآخر رمسرنا جیت گیا۔ اُسنے پجاری کو اپنے سینے سے اس طرح اُتار پھینکا جس طرح سانپ اپنے سر پر لدے ہوئے نیولے کو جھٹک دیتا ہے۔ اور مندر سے نکل کر بھاگا۔ وہ کالی دور تک بھاگتا رہا۔ لیکن بھاگنا بے سود تھا۔ کیوں کہ پجاری نے مندر سے باہر نکل کر اس کا پیچھا کرنا بے مقصد سمجھا ہوگا۔

رمسرنا گھومتا ہوا کانجی ہاؤس کے سامنے جا نکلا۔ یہ شہر کی آخری پختہ عمارت تھی جس کے پاس ہی ندی کا پل تھا، اور وہیں سے گاؤں کو راستہ جاتا تھا۔ لیکن بیچ رات میں گاؤں جانے کی اس کی ہمت نہ ہو سکی۔ وہ کانجی ہاؤس کی دیوار چڑھ کر اندر اُترا، جہاں ایک گدھا اندھیرے میں سویا ہوا سا لگتا تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر وہ بھی بھوسے پر سو گیا۔

ندیدی

اگلے دن گاؤں جاتے ہوئے اس نے سوچا 'وہ لوگ مجھے مسلمان کیوں کرنا چاہتے تھے؟ انہیں مجھے مسلمان کر کے کیا ملتا! مجھ سے انہیں پیار تو تھا نہیں، اور کونسا ہمیشہ اپنے گھر سے کھلاتے! پھر اسے خیال آیا پجاری بھی اس کا بھلا چاہنے والا نہیں تھا۔ پھر وہ کیوں چاہتا تھا رمسرنا ہندو ہی رہے، اسے میرے ہندو رہنے سے کیا ملتا اور کون سا ہندو جاتی والے سدا میرا لالن پالن کرتے!'

اُس نے سوچا بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا کارن بہت سے کام کرتے ہیں — انہی میں سے بڑے بابو کے گھر والے تھے، اور یہ مہراج اور اُسکا باپ۔

○

رمسرنا

ماہنامہ افکار، کراچی - ستمبر ۱۹۶۴ء
۲۰/۱۵۷، ۳۹ تا ۵۳

لَلّی

ایشار الدین کو ایثار الدین کہنے سے فائدہ جب اُسے اس نام سے قصبے بھر میں کوئی نہیں جانتا؟

رسول پور کے لوگ اپنے عقیدے کے پکے ہیں۔ انہیں اگر یہ سمجھایا جائے کہ شادی کنبے اور برادری کے باہر بھی ہو سکتی ہے تو ان کا تھوڑا سوچ جائے گا۔ اگر ان کا اعتقاد حکیم کی دوا پر ہے تو وہ دنیا کے کسی اور علاج کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔ اور اگر اُن سے کسی ایسے انسان کی نماز جنازہ میں شرکت کو کہا جائے جس کے باپ کا پتہ نہ ہو تو وہ منہ پھیر کر چل دیں گے بلکہ ان کے یہاں خودکشی کرنے والے کی میت کو کندھا دینا بھی حرام سمجھا جاتا ہے۔ ایشار الدین ان لوگوں کی راسخ الاعتقادی اور معصومیت کا معترف بھی تھا، اور دل ہی دل میں ان کی

سخت گیری سے متنفر بھی۔ جس طرح قانون کے محافظ خود قانون کی پابندی سے کتراتے ہیں۔

(۱)

ایشارالدین کی خواہش تھی گھر پہونچنے سے پہلے پہلے وہ لڑکی کا تعین کر لے۔ ایسی لڑکی جو فی الحقیقت کنواری ہو اور جس تک اس کی پہونچ ہو سکے۔ ورنہ کنبہ اور قصبہ لڑکیوں سے پٹا پڑا تھا۔ اِن دو شرائط پر اس کی زندگی کا داروسدار تھا، اِن کے پورا ہو جانے پر اس کی عزت بچ سکتی تھی۔ اپنی بیوی، سسرال والوں اور باقی ناتے داروں کے طعن و تشنیع سے بچنے کی ایک یہی صورت تھی۔

رات کو جب سب سونے کی تیاری کر رہے تھے اور ایشارالدین اپنے گھناؤنے مرض کو چھپائے دم سادھے پڑا تھا، اُسنے دو ملاحوں کو کانا پھوسی کرتے سنا تھا

"مرض مرض علیحدہ ہوتا ہے۔ کوئی کا علاج ڈاکٹر لوگ جانتے ہیں، کوئی کا نہیں۔ عورت کا بیماری عورت سے جاتا ہے"۔

دوسرا ملاح جو جہاز کا سُکان گھمانے پر ملازم تھا اور دن بھر مچھلی کا جال بنتا تھا، ٹوہ لینے کی خاطر ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی سنتا تو نہیں۔ پھر ہولے سے بولا

"چاچا کسی بھی عورت کے پاس جانے سے؟"

"نہیں کنواری ہونا لازم ہے"

"تجربے کی کہتے ہو؟"

"تجربے والوں کی سنی کہتا ہوں"

اس گفتگو نے اپشارالدین کی آدھی بیماری دور کر دی۔
باتیں کرنے والے بھی سو گئے۔

پورٹ ہول میں سے گھس کر چاند کی کرنیں سونے والوں کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ باہر سمندر پرسکون تھا اور جہاز خاصی اچھی رفتار سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

یہ پچھلی رات کی بات تھی۔

اِس وقت سمندر بپھرا ہوا تھا۔ باہر سے دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اور اپشارالدین لڑکی کا تعین کر لینا چاہتا تھا۔ جو کہیں ایسی لڑکی مل جائے تو سارا دلدر دور ہو سکتا ہے۔ گناہ کا احساس جس سے بیشتر ملاح ناواقف ہوتے ہیں اپشارالدین کے لئے بھی محض ایک لفظ تھا، جس طرح بول چال میں سیکڑوں اور بے معنی لفظ ہوتے ہیں۔

چنانچہ ڈوبن میں رات بھر غائب رہنے کے بعد جب وہ جہاز پر لوٹا تو اس پر نیند کا غلبہ تھا۔ اس نے دیکھا خلاف معمول کئی اور ملاح بھی پیر پھیلائے سو رہے ہیں۔ اُس نے جا کر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور خود بھی آ کر سو رہا۔

سوتے وقت وہ اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کے ساتھ اسنے رات جاگ کر کاٹی تھی اور جس کے منہ سے بیئر کی کھٹی ڈکاریں آ رہی تھیں۔ اس کا سیاہ چمکدار جسم اور اندھیرے میں چمکنے والے اجلے دانت۔ آہستہ آہستہ وہ انہی خیالوں میں ڈوبا دوسری دنیا میں پہونچ گیا۔

دوپہر کو جب وہ سو کر اٹھا تو اسنے دیکھا — وسوئی

میں لوگ کھل کر اپنی بوالہوسی کے قصے سنا رہے تھے۔ اب یہ قصے ہی ان کا زاد راہ ہیں۔ ان قصوں کی حدت سے ان کا خون اگلی بندرگاہ میں جہاز کے پہونچنے تک حرکت کرتا رہے گا۔ اس ذکر میں لذت بھی تھی اور بے مزہ زندگی کو تیر کرنے کا آسرا بھی۔ لیکن ایشارالدین جس کا یہ پہلا بڑا سفر تھا، لذت کے اس تلچھٹ والے تصور سے نا آشنا تھا، جب آدمی کی زبان چھٹی حس کا آلہ کار بن جاتی ہے۔

لیکن شرم گناہ سے مختلف ہے۔ شرم آدمیوں سے آتی ہے، گناہ کا تعلق خدا سے ہے۔ آدمی کسی کی غلطی دیکھ کر خدا کی طرح خاموش نہیں رہتے۔ شرم گناہ سے زیادہ واضح اور کہیں زیادہ تند و تلخ حقیقت ہے۔

ایشارالدین کا جسم جب مرض سے بھبھک اٹھا تو اسے فکر نے گھیر لیا۔ گھر پہونچنے پر یہ راز راز نہ رہ سکے گا۔ قصبے والے، سسر سالے، باپ بھائی، چچا سب جان جائیں گے کہ ایشارالدین بیمار ہے اور اسکی بیماری بھی وہ ہے کہ تیمارداری کرنے والے دلاسے کی جگہ الہانا دیں گے۔ ہمدردی کی جگہ نندا اس کے زخموں کو کریدے گی۔ لوگ اس کے برتن میں کھاتے ہوئے ناک بھوں سکیڑیں گے اور پورے گاؤں میں تھڑی تھڑی ہوگی۔ ایسے میں کسی ڈاکٹر، وید یا حکیم کے پاس جانا تو اور بھی خطرناک ہوگا۔

ایشارالدین کی بیوی بڑی تیز رفتاری سے عمر کو پہونچ رہی تھی۔ گاؤں سے جو خط اس کے ایک بچپن کے ساتھی نے لکھا تھا، اس میں ایک جگہ یہ بھی تحریر تھا —

''بھابی اب دیکھنے میں کم ہی آتی ہے۔

تمہاری ماں نے ایسا جان پڑتا ہے اُسے
پردے میں بٹھا دیا ہے۔ پچھلے دنوں یہاں
رام لیلا دیکھنے کے لئے بھاری ہجوم تھا۔
اُس میں میں نے بھابی کو دور سے دیکھا۔
اب تو وہ سیانی ہوگئی ہے"۔

لیکن للی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ کترا رہا تھا۔ ایک تو تھی کھٹیک کی لڑکی جسے اُسنے اکثر آموں کے باغ سے گذرتے ہوئے دیکھا تھا، دوسری تھی امینہ جو اپنا طوطا کھوجنے اُن کے چوبارے میں آئی تھی، تیسری تھی اس کی اپنی رشتے کی ایک خالہ، اور چوتھی زمیندار کی لڑکی — پانچویں؟

'پانچویں تمہاری اپنی للی!' کسی نے اس کے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

ایشارالدین نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کیبن اسی طرح خاموش تھا، البتہ چند شوریدہ سر لہریں پورٹ ہول میں سے پانی اندر اُلیچ رہی تھیں اور جہاز بے طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔

ایشارالدین نے اُٹھ کر لوہے کی بھاری پلیٹ سے پورٹ ہول کو ڈھکا، اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی صورت پرتحسین نظروں سے آئینے میں دیکھنے لگا۔ جس وقت وہ جہاز کے "پورٹ پکڑنے" پر دوسرے ملاحوں کے ساتھ ٹیکسی میں گھومنے نکلتا تو یہ کہنا مشکل ہوتا تھا کہ وہ خلاصی ہے، کھانا کھلانے والا ملازم، بھنڈاری کا اسسٹنٹ یا کوئی بڑا افسر! اور یہ کہ اس کے کنبے والوں میں سے کسی نے تیس کوس اِدھر اور تیس کوس اُدھر باہر قدم نہیں نکالا تھا۔

باہر آہٹ پا کر وہ غڑاپ سے اپنے بستر میں گھس گیا۔

دروازہ بھڑاکے سے کھلا۔ جس ملاح نے رات چاچا سے وہ مشورہ لیا تھا گنگناتا ہوا کیبن میں داخل ہوا، اور اپنا بکس کھول کر کچھ کھکھوڑنے لگا۔

پھر اُس نے ایشارالدین سے پوچھا

"طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں رات کی ڈیوٹی ہے"

"دے لو بیٹا رات کی ڈیوٹی: یہاں کپتان کی ہے گھر پر بیوی کی ہوگی"۔

کیبن سے باہر جاتے ہوئے اسنے شیشے پر چپکی ہوئی نیم عریاں عورت کی تصویر کو پیار کیا، اور پھر دھماکے سے دروازے کو بند کرکے چل دیا۔ لوہے کے فرش پر اس کے جوتوں کی آواز دور تک سنائی دیتی رہی۔

ایشارالدین اس وقت اپنے ذہن میں اتنے بڑے گلے کی کسی ایک گائے پر ٹھپا لگانے کو تیار کھڑا تھا۔ دوسرے آدمی کے آنے جانے سے وہ گائے بھڑک کر لات مار کر چلتی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اسے گھیر کر لانا تھا۔

کھٹیک کی لڑکی کو وہ بچپن سے جانتا تھا۔ خاصی ٹینکر(*) سائز کی لڑکی تھی۔ گہری سانولی رنگت اور ہمیشہ مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ پیر۔ اسکا باپ ہر سال زمیندار سے آموں کا باغ ٹھیکے پر لیتا تھا، اور وہ ایک چوتھائی فصل خود کھا جاتی تھی — کیونکہ ایشارالدین نے اسے ہمیشہ آم چوستے ہوئے دیکھا تھا۔ کبھی وہ

---

* آئل ٹینکر: تیل لیجانے والا بڑا جہاز

باغ کی دیوار پر اکڑوں بیٹھ کر، کبھی درخت کی ڈال پر پیٹ اور چھاتی کے بل لیٹ کر اور کبھی تال میں پیروں سے چھپاچھپ کرکے آم چوستی اور گٹھلیاں پانی میں پھینکتی جاتی تھی۔

جہاز پر آنے سے پہلے ایشارالدین نے اس کی ایک حرکت دیکھی تھی —

گرمیوں کی دوپہر تھی اور وہ بازار سے سن کی رسیاں بیچ کر واپس لوٹ رہا تھا۔ باغ میں سے گذرتے ہوئے وہ کنوئیں کے پاس پانی پینے کو ٹھیرا تو اسے سکینہ دیوار پر سے آدھی باہر کو لٹکتی ہوئی نظر آئی، جیسے دوسری طرف سے اسے کوئی کھینچ رہا ہو۔ اندر کی طرف اس کی ٹانگیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور اس کا لہنگا ہوا سے اڑ رہا تھا۔

پھر یکبارگی وہ چیخی —

”ارے چھوڑ مجھے — گری!“

جس طرح ہاتھ سے چھوڑنے پر درخت کی لچائی ہوئی شاخ اوپر کو اچھلتی ہے سکینہ دیوار سے کود کر ایچے کھڑی ہوگئی۔ اُس نے اپنے پیچھے ایشارالدین کو کھڑا پایا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

دیوار کے باہر سوکھے پتوں پر کوئی بھاگا۔ دو ایک پنچھی اس معمولی سے شور پر شاخوں میں پھڑ پھڑائے۔ اس کے بعد مکمل خاموشی ہوگئی۔

وہاں آموں کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑی وہ منتظر تھی کہ ایشارالدین کچھ کہے۔ جو کچھ ہنگامہ بعد میں ہونا ہے اس کا بھید بھاؤ ابھی سے مل جائے۔

لیکن انتظار کے باوجود ایشارالدین خاموش کھڑا اُسے تکتا رہا۔

پھر بے وجہہ چونک کر سکینہ نے ایک رحم بھری نگاہ اس پر ڈالی، اور دل لبھانے والی ادا سے اپنی ٹھوڑی کو جھٹکا دے کر چلتی بنی۔

اس سے زیادہ ایشارالدین کی اس سے واقفیت نہ تھی — لیکن اس سے زیادہ واقفیت ایک مرد کی کسی عورت سے اور ہو بھی کیا سکتی ہے؟

ایک دم جہاز سیٹیوں کی چیخ پکار سے گونج اٹھا۔

ملاح اپنی اپنی لائف بیلٹ سنبھالے کشتیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جب وہ کیبن سے باہر نکلا تو دھوپ آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ تکلیف کی وجہ سے بھاگ کر چلنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔

”آگ! آگ لگ گئی!“ ایک لمبا لڑکا تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا بولا۔

”ایسی آگ تو روز لگتی ہے“ ایک بوڑھے ملاح نے جواباً کہا۔

”کبھی لگے بھی“ ایشارالدین نے جلے ہوئے دل سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب ریہرسل ختم ہوگیا تو اسی کسل مندی کو لئے ہوئے وہ بستر میں گھس گیا۔

شام کو جب گائیں بھینسیں جنگل سے اوٹتی ہیں تو لوگ اپنے اپنے دروازوں پر کھڑے گلّے میں سے اپنی گائے پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایشارالدین کے دل میں پھر دھکر پکر شروع ہوئی۔

سکینہ کا تو ہو سکتا ہے گونا بھی ہو گیا ہو۔ امینہ سے بات کر کے دیکھوں؟ وہ سکینہ کی طرح ہتھ چھٹ نہیں ہے۔ سکینہ کے باغ سے کوئی کیری بھی اٹھالے چلا جائے تو لڑنے کو کھڑی ہو جاتی ہے۔ امینہ شرمیلی ہے اور ہر بات کے جواب میں سر جھکا دیتی ہے۔

پچھلے پوس کی بات ہے۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ اس کی بیوی کہیں کھیل کود میں لگی ہوئی تھی۔ ماں رسوئی میں تھی اور وہ چوکی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ چوبارے میں چٹیا ہلاتی ننگے پیر امینہ داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں درختوں پر تھیں اور دوپٹہ گلے میں۔

دور سے ایشارالدین کی ماں کی آواز آئی

”امینہ!“

”ہوں“ اُس نے اسی طرح درختوں پر نظر جمائے جمائے کہا۔

”للی کو دیکھنے آئی ہے؟“

”نہیں میرا طوطا اڑ کر ادھر آیا تھا“

ایشارالدین کی ماں نے لہجہ کڑا کر کے کہا

”دوپٹہ تو ٹھیک سے اوڑھا کر ری“۔

امینہ نے دوپٹے کو پھیلا کر اپنے سینے پر ٹھیک کرنا چاہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گریبان میں خود فریفتگی کے ساتھ جھانکنے لگی۔

تب ہی اُس کی نظریں کمرے کی طرف اٹھیں، ایشارالدین دیر سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ امینہ کو ایسا لگا اُسے نہانے میں کسی

نے دیکھ لیا ہے۔ سر جھکا کے پھرتی سے وہ دیوار کی اوٹ میں چلی گئی۔

دو تین دن بعد جب وہ امینہ کے گھر کی طرف سے گذر رہا تھا اس نے دیکھا امینہ نے اسے دیکھ کر اپنا سر جھکا لیا ہے۔ برابر سے گذرتے ہوئے ایشارالدین نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا: ایسا لگتا تھا وہ کچھ کچھ شرما رہی ہے۔

چاچا نے وہ الفاظ کیوں کہے تھے؟ یہ سب سوچ سوچ کر وہ کل رات سے پریشان ہو رہا تھا۔ گاؤں کی جن لڑکیوں کی چوریاں اس کی مٹھی میں تھیں، حافظہ گھیر گھار کر انہیں ایشارالدین کے روبرو لا رہا تھا۔ جہالت نے اُسے کافی عرصہ کے بعد ایک دلاسا دیا تھا کہ اس کا چھوٹا سا یہ راز— اس کی اس پچیس سالہ زندگی کا سب سے بڑا راز — راز ہی رہے گا۔ اور جب سب کچھ ہو ہوا کر ختم ہو جائے گا، تو کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا

'اب سے دور ایشارالدین سمندر پر نوکری کے لئے گیا تھا، اور وہاں سے ایک بہت ُبری، بہت گندی بیماری لگا لایا تھا'

چرچا کے تصور سے اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگتی تھیں — جس طرح شاید قبر میں مردوں کے جسم پر رینگتی ہوں گی۔ لیکن اگر اس درد کا مداوا مل جائے تو بات ہمیشہ ڈھکی رہے گی۔ چٹیل میدان میں جب بارش کے چھینٹوں سے دھول بیٹھ جاتی ہے تو اس ٹھنڈی پرسکون جگہ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں سانس لینا دشوار تھا!

ایشارالدین نے جلن اور درد کی لہروں کو پے بہ پے خود پر حملہ آور ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے وہ لہریں اس کا جہاز

جل رہا ہو اور بجائے آگ بجھانے کے لہریں اس نابود ہو جانے کے عمل کو تیز تر کر رہی ہوں۔ جہاز کے ساتھ اس نے خود کو بھی غرقاب ہوتے دیکھا لیکن مشکل یہ تھی اس حالت میں وہ دعا نہیں مانگ سکتا تھا۔ پھر وہ ایک عجیب تجربے سے گذرا

وہ گاؤں کے حکیم سے آہستہ آہستہ شرما شرما کر اپنا مرض بتا رہا تھا۔

پھر حکیم ایک دوا اندر سے لانے کے بہانے وہاں سے اٹھ گیا، اور اس نے پچھلے گلیارے میں نکل کر ہر راہ گیر سے کہنا شروع کیا

”ایشارالدین جانتے ہو کون سا مرض لگا لایا ہے؟“

راہ گیر نے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے ڈنڈے سے لٹکتے ہوئے جوتے زمین پر گرائے اور انہیں پہنتے ہوئے بولا

”جانتا ہوں۔ ہر جہاز پر جانے والا ایک ہی روگ، لے کر آتا ہے — عورت کا“۔

للی چاندنی رات میں اپنی سہیلیوں کے سنگ اونچا نیچا کھیل رہی تھی۔ اب وہ ان میں سب سے بڑی دکھائی پڑتی تھی۔ آٹھ سال پہلے کی للی میں اور اب میں کتنا فرق تھا! بچوں کی سی معصومیت اس میں ابھی بھی باقی تھی لیکن بچپن جا چکا تھا۔

شادی کے دن اس نے بڑا رونا ڈالا تھا۔ اسے ہر چیز سرخ چاہئے تھی، اور اس کی ماں ہنس ہنس کر اس کے ارمان پورے کر رہی تھی۔ پھر جب وہ بیاہ کر اپنی سسرال آئی تو تھوڑی دیر ہی ایک جگہ بیٹھ کر گھبرا گئی۔ پڑوس سے ایک چھوٹا سا لڑکا اسے بلانے آیا

”آؤ للی باہر چل کر کھیلیں“

وہ فوراً اس کے ساتھ کھیلنے چل دی۔ اور سورج ڈوبنے تک باہر

کھیلتی رہی۔

پھر اُس کی ساس نے اُسے اندر سے آواز دی

"اری آ کر دودھ تو کھا لے"

دودھ کھا کر اُس نے اپنے گھر جانے کی رٹ لگا دی۔

ایشارالدین نکاح کے بعد سے ایسا اچنت ہوکر بیٹھ گیا تھا گویا اپنی نہیں کسی اور کی شادی میں شریک ہوکر آیا ہے۔ تقریباً وہی بے نیازی تھی۔

پچھلے سال جہاز پر آنے سے پہلے اس نے غور سے للی کو دیکھا تھا۔

ابھی تک وہ رات کو اپنی ساس کے گلے میں باہیں ڈال کر سوتی تھی۔ اور جب اس کی ساس اسے ایشار الدین کا نام لے کر چھیڑتی تو وہ مصنوعی ادا سے شرما بھی لیتی تھی۔

پچھلے سال وہ بارہ تیرہ برس کی تھی اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے گائے دوہ لیتی تھی۔ چلتے وقت اُس نے سانی کرتے ہوئے ایشارالدین کی طرف دیکھا تھا اور پھر کام میں مگن ہوگئی تھی۔

پھر گائے ایک دم رسہ تڑا کر بھاگی۔ لیکن ایشارالدین اس وقت تک لوہے کی مہر کو آگ پر دہکا کر سرخ کر چکا تھا، اس نے گائے کو سینگوں سے پکڑ لیا، اور اس کی خوب صورت پچھاڑی پر لوہے کی گرم مہر رکھ دی۔ بال چرچرا کر جلے اور جل کر کھال لوٹ گئی۔ گائے نے منہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

جب وہ جاگا تو پسینے پسینے ہو رہا تھا اور اس کے اندر کُلبلی مچی ہوئی تھی۔ اسے تعجب تھا سکینہ، للی، امینہ اور زمیندار کی بیٹی کا خیال آنے پر نہ جانے کہاں سے گائیں بھینسیں بھوسہ

اور نالدیں بیچ میں پھالد پڑتی تھیں۔

تھوڑی دیر کے لئے اس نے پھر سکینہ کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی، اور اپنے پیر کے الگوٹھے سے زمین کھود رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے بھی دیکھ لیتی تھی جیسے سزا سننے کے لئے وہاں کھڑی ہو۔

امینہ سے اس نے ایک دن گلی میں سے گذرتے ہوئے آہستہ سے پوچھا تھا

"طوطا مل گیا؟"

اس نے اس کی طرف چور نظروں سے دیکھا، پھر ہمت کرکے ایک دم بول پڑی

"اب اتنے دن بعد؟"

اس کے بعد ایشارالدین مکمل طور سے جاگ اٹھا۔ رات کا کھانا کھانے کا وقت آ چکا تھا۔ چند مسافر ریلنگ سے باہر سر لٹکائے الٹی کر رہے تھے۔ اور دور پچھم میں — معلوم نہیں پورب ہے یا پچھم، جہاز پر وقت اور سمت کا کیا پتہ چلتا ہے — سورج سرعت سے ڈوب رہا تھا۔ لہروں کے اوپر سفید مچھلی مار پر پھیلائے اڑ رہے تھے۔ لہریں دھیرے دھیرے سیاہی میں چھپتی جا رہی تھیں۔ البتہ جہاز کا پھیلایا ہوا جھاگ دور تک ہلکورے لیتا نظر آتا تھا۔ اندر ایک عرب عورت تختے پر کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ اور اس کے چاروں طرف بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔

ایشارالدین کو ایسا لگا وہ سخت مٹی پر بسے ہوئے کسی شہر میں کھڑا ہے۔

کھانا کھلانے کے بعد ایشارالدین کھڑا ہوکر لہریں گننے لگا۔

اس جہاز پر شاید یہ اس کا آخری سفر تھا، لیکن اتنا ساز و سامان اکھٹا کرنے کے باوجود اسے گھر جانے کی خواہش نہیں تھی، وہاں پہونچ کر بھی اگر اس مرض نے پیچھا نہیں چھوڑا، تو زندگی دوبھر ہوجائے گی۔ پچھلے دو مہینے سے وہ اس آگ میں جل رہا تھا۔ اس کی ہڈیاں جلتی رہی تھیں، اور دن رات وہ اُس گھڑی اور اُس دن کو روتا تھا جب ڈربن میں اُس سیاہ فام عورت سے بھینٹ ہوئی تھی۔

وہ اُسے گالیاں دینا چاہتا تھا اور اگر ممکن ہوتا تو اس کا نام لیکر۔ لیکن دونوں ہی نے ایک دوسرے کا نام نہیں پوچھا تھا۔ ان فروعات پر ضائع کرنے کے لئے دونوں کے پاس وقت نہیں تھا۔ عورت نے اس سے صرف ایک غیرمتعلق بات کی تھی: وہ اُس پر احسان کر رہی تھی کیوں کہ وہ سیاہ تھی اور ایشارالدین کلرڈ۔ اس لئے وہ قانون کی گرفت میں آنے کا خطرہ مول لے رہی تھی۔ یہی بات وہ دوسروں کو بھی بتاتی رہی تھی — وہ سیاہ تھی اور دوسرے سفید یا کلرڈ۔

اہمیت ایک کے مرد اور دوسرے کے عورت ہونے کی تھی، لیکن اس بات کو نسل پرست جنوبی افریقہ کا قانون نہیں مانتا تھا۔ بچپن میں ایک بار اسے نمونیا ہوا تھا تو ماں نے رات بھر تیل کی مالش کی تھی، اور دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کی تھیں۔ یہ مرض خاموشی سے برداشت کئے جانے والا تھا۔

پھر ایشارالدین کو وہ لڑکی یاد آئی جو ان کے یہاں دور کے کسی گاؤں سے چند دن کے لئے آئی تھی— اس کی ماں کے رشتے کی بہن۔ گھر میں کسی کی شادی کا ہنگامہ تھا اور ایشارالدین بھی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ جب وہ دروازہ بنانے کے لئے کیلے کا

پیڑ کاٹ کر لا رہا تھا تو جمیلہ اسے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔
اُس نے آواز دی
"جمیلہ!"
"کیا ہے؟" جمیلہ نے پاس آتے ہوئے کہا "نام لیتے ہو، چھی چھی، میں تمہاری خالہ ہوں"۔
"اس سے کیا ہوتا ہے۔ عمر میں تو چھوٹی ہو"۔
"میں چھوٹی ہوں؟" جمیلہ نے تنتے ہوئے کہا۔
"ہوں" ایشارالدین نے درخت کو زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا۔
"لو دیکھ لو"
"کیا؟"
"کچھ نہیں" جمیلہ نے اٹھلا کر کہا اور اندر چلی گئی۔

ایشارالدین دیر تک چکنے اور نم تنے پر گال رگڑ رگڑ کر سوچتا رہا —
'آخر مجھے جمیلہ کو بلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟'

اگلے دن جب وہ تیار ہوکر باہر جا رہا تھا جمیلہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس سے گذری۔ پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹی اور اس کی جیب سے ابھرا ہوا نیا ریشمی رومال لے کر بھاگ گئی۔ اُس کی اِس حرکت پر ایشارالدین جھلا اٹھا۔ رومال جو نیا تھا اور اس نے بڑے چاؤ سے خریدا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب اُسکی ماں کو اس حرکت کا پتہ چلا تو جمیلہ رومال لوٹانے آئی۔ ایشارالدین اندھیری کوٹھری میں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ جمیلہ نے پاس آکر رومال دوبارہ اسکی جیب

میں ٹھونس دیا۔

پھر پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے ایشارالدین کا گال نوچ لیا۔

"آپا سے کیوں کہا تھا؟ یہ اسکی سزا ہے"۔

ایشارالدین نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر بدلہ لینا چاہا، لیکن جمیلہ نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

'ایسی لڑکیوں کو کیا کہتے ہیں؟' ایشارالدین کئی روز تک سوچتا رہا۔ لیکن وہ لفظ جیسے یاد آتے آتے بھول جاتا تھا۔ 'دیدہ پھٹی؟۔ نہیں اور کچھ۔ آنکھیں پھٹی'۔ پھر وہ ہنس پڑا۔ 'بات تو ایک ہی ہوئی'۔

آج کئی سال بعد وہ جمیلہ کو سمجھنے کے لائق ہو گیا تھا۔ اس بیماری نے جہاں بہت سے جانے پہچانے چہروں کا تعارف ایک بار پھر اس سے کرایا تھا، وہاں جمیلہ بھی ایسا لگتا تھا بالکل نزدیک آ گئی ہے— اتنی نزدیک کہ اس کی سانس ایشارالدین اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔

'پانچویں لڑکی زمیندار کی ہے' اُسکا دماغ ابھی تک اپنی دھن میں لگا ہوا تھا۔

ایشارالدین ان کے گھر اپنے باپ کی طرف سے نیوتا لے کر گیا تھا۔ برآمدے میں ایک لڑکی جھولے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جھولے کا تخت کافی بڑا تھا اور اس پہ بیٹھی ہوئی وہ دھان پان سی نظر آتی تھی۔ لوہے کی سلاخیں ہر جھونکے کے ساتھ کچھ ایسی آوازیں فضا میں بکھیر رہی تھیں کہ اگر اسکی جگہ کوئی اور جھولے میں بیٹھا ہوتا تو ایشارالدین سوتے سے جاگ پڑتا، اور

بکنے لگتا۔

لیکن اس لڑکی کو جب اُس نے اُن آوازوں پر جھولتے دیکھا تو اس کے کانوں میں کسی ان جانے راگ کا الاپ شروع ہوگیا۔

اس نے دیکھا لڑکی ہاتھوں میں مہندی لگائے ہوئے ہے اور اس کے انگوٹھوں تلے نیبو کے پتے دبے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں کی پشت سے سوکھی ہوئی مہندی جھڑ چکی تھی، اور سرخ رنگ اس کے سفید ہاتھوں پر کھل رہا تھا۔

جب اس نے ایشار الدین سے کچھ پوچھا تو وہ خواب سے چونک پڑا۔

"میں نیوتا دینے آیا تھا"

"کاہے کا؟" لڑکی نے انگلیوں سے مہندی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"پہلا روزہ ہے" ایشار الدین نے بڑی ہمت سے کام لے کر کہا۔

"تمہارا؟" لڑکی نے پیروں سے زمین کو دھکیلتے ہوئے کہا۔

"نہیں للی کا"۔

"تمہاری للی ہے؟" اس نے پیر کے انگوٹھوں سے زمین پر جھولے کی حرکت توڑتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں میری —"

"کیا؟"

ایشار الدین نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اچھا!!" زمیندار کی بیٹی ہنسنے لگی۔

رات کو افطار کے بعد جب کٹھ پتلی کا تماشہ شروع ہوا تو اُس نے لوگوں سے تھوڑے فاصلے پر اکیلے میں ایشار الدین کو

جا لیا اور اس سے اپنا جوڑا ٹھیک کروایا۔ پھر وہ لڑکیوں میں مل کر کھو گئی۔

بعد میں جب مہمان جا رہے تھے تو اپشارالدین نے دیکھا وہ پہلی کے پردے میں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

مگر نجانے اب اتنے برس بعد وہ اپشارالدین کو پہچانے گی بھی یا نہیں۔ اور اگر پہچان بھی گئی تو کیا ضروری ہے کہ بات بھی کرے!

(۲)

ان بیکل کردینے والے دنوں کے تھوڑے عرصے بعد ایک صبح اپشارالدین ہانپتا کانپتا اپنی کم سن بیوی سے علیحدہ ہوا، وہ دونوں اُس وقت اپنے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک کچی عمارت میں گھسے ہوئے تھے جس پر چھپر چھایا ہوا تھا، اور اندر کی ہوا گئو موت سے بسی ہوئی تھی۔ گذرے ہوئے دن کی بارش سے دیواریں سیل گئی تھیں، اور ان سے نکلنے والی سوندھی خوشبو جانوروں کی پھیلائی ہوئی دماغ کو چیرنے والی تیز بو میں مل کر عجیب اثر پیدا کر رہی تھی۔

جب وہ گھنٹہ بھر پہلے یہاں آئے تھے تو اپشارالدین گھبراہٹ میں یہ دیکھنا بھول گیا تھا کہ مویشی خانے میں جانور ہیں یا چرنے جا چکے ہیں۔ لگاتار بارش سے گلیاں نہریں بن گئی تھیں۔ ایسے میں گوالے نے سوچا ہوگا کہ گھر بیٹھنا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن اپشارالدین کے لئے گھر میں بیٹھنا مناسب ہو یا نہیں مشکل ضرور تھا۔ اس نے للی سے یہاں آنے کے لئے کہا تھا۔

ایسا لگتا تھا اُس کے دوست نے وہ خط اچھی طرح دیکھ بھال

کر ہی لکھا تھا۔ للی برس بھر سے اس کی راہ تک رہی تھی۔

جب ایشارالدین گھر لوٹ کر آیا تو اُن کی آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ ان دونوں نے ایک دوسرے کی خیرخیریت معلوم کی۔

پچھلا حجاب ابھی باقی تھا، اور للی خود سے قدم اٹھانا شاید ابھی تک جانتی ہی نہیں تھی۔

ایسے میں جب ایشارالدین نے اس کے نزدیک سے گذرتے ہوئے پوچھا

"کہو للی اچھی ہو؟"

تو وہ سوہ بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

ایشارالدین نے دوبارہ اس کے گرد چکر کاٹا اور دبی ہوئی سانس میں بولا

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"۔

للی اس کی طرف متوقع نظروں سے دیکھتی رہی۔ لیکن جب ایشارالدین خاموش رہا تو اس نے ہمت کر کے پوچھا

"یہاں نہیں؟"

"نہیں۔ وہی میں بھی سوچ رہا تھا، تم گنیوں والے چھپر میں نہیں جا سکتیں؟"

للی نے اثبات میں سر ہلایا اور بظاہر پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

ایشارالدین گھر سے نکل کر گنیوں والے چھپر کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اس کا دماغ بالکل خالی تھا یا یوں کہنا چاہئے کہ

اندر سے اٹھنے والے مبہم متضاد خیالات کو دبانے کے لئے وہ سوچنے اور سمجھنے سے کترا رہا تھا۔

پہلے وہ ادھر اُدھر بھٹکتا پھرا۔ اسے معلوم تھا گھر سے نکلنے کے لئے للی کو کوئی بہانہ چاہئے اور اس میں ممکن ہے کچھ دیر لگ جائے۔

للی سہمی ہوئی سی تھی لیکن دل میں مگن تھی۔ ایشارالدین کتنا بھولا ہے۔ کتنا سیدھا ہے۔ سچ ہے، خود اپنی بیوی سے بات کرتے ہوئے گھبراتا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر اس پر ایک نشہ چڑھ رہا تھا۔ اب وہ اپنی سکھیوں سے دون کی لے سکتی ہے۔ ان کے شوہروں کی طرح ایشارالدین منچلا نہیں تھا۔

جب وہ گھر سے نکلی تو اس کے دماغ میں چھوٹے چھوٹے منوہر سپنے جاگ اٹھے۔ ایشارالدین کو اُس سے کیا کہنا ہے، اِس کی اسے مطلق کرید نہیں تھی۔ اگر وہ تھوڑی دیر بھی لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر ایک دوسرے کے پاس کھڑے رہیں تو یہ بھی اس کے لئے بہت کچھ تھا۔ ممکن ہے ایشارالدین اس کے لئے سمندر پار سے کوئی ایسی چیز لایا ہو، جو سب کے سامنے دی جانے والی نہ ہو۔ ایسی چیزیں بہت سی ہوتی ہیں یہ وہ جانتی تھی اور اِس خیال کے آنے پر اُس کے کان تمتما اٹھے۔

جھیر میں گھستے ہوئے اس نے اپنے اوسان درست کرنے کی ناکام کوشش کی۔

لیکن جب ایشارالدین اس کے پاس سے اٹھ کر بھاگا تو وہ رو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا میلے کے شوق میں خوش خوش گھر سے جانے والی کوئی بچی وہاں کسی کا گلا کٹتے دیکھ کر ڈر گئی

ہے، جس کی اس کے ننھے سے دل کو برداشت نہ تھی۔ اُسکا جسم پھوڑے کی طرح دکھہ رہا تھا اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔

اُس چھپر کے نیچے گایوں بیلوں کے سامنے، اندر آتے ہی، اُس نے ایشارالدین کو عجیب انداز سے ہانپتے دیکھا تھا۔ اور وہ سہم سی گئی تھی۔ بعد میں وہ بے سدھ ہوکر بھوسے پر گر پڑی تھی۔

چھت کی کڑیاں دھیرے دھیرے اس کی آنسو بھری آنکھوں میں تیرنے لگیں جس طرح ندی میں ٹوٹے ہوئے درخت بہا کرتے ہیں۔

ایشارالدین اٹھکر کھڑا ہوا تو اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دونوں میں اس عرصہ میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے وہاں سے روانہ ہوتے وقت بھی اُس نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

البتہ باہر نکلتے ہوئے اس نے دیکھا — ایک گائے جس کے سر پر بالوں کا بھونرا تھا اور جس کی ٹانگوں اور کمر پر بڑے بڑے بادامی رنگ کے دھبے تھے، اس کی طرف گردن گھما کر غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چکرا سا گیا۔ گائے آج اسے بالکل نئی نظر آئی۔ اس کا جگالی کرتا ہوا منہ ایشارالدین کو نزدیک آتے دیکھ کر رک گیا۔

للی نے کونے میں دو ایک بار سبکیاں لے کر بھوسے پر کروٹ لی تو اس کے کھنڈوے نالد سے ٹکرائے۔ اب تک جو سکتہ اُس پر طاری تھا اُس سے نکلتے ہوئے للی کے ذہن میں ایسی ہی کئی تصویریں ابھریں۔ جس طرح بارہا شادی کے دوسرے تیسرے دن بلکہ ہفتوں بعد تک اُس نے عورتوں کو کسی کی پہلی رات پر تبصرہ

کرتے سنا تھا۔ بالکل اُسی طرح کی محبت اور گفتگو سے تھی رات۔

ایشار الدین گھبرا کر کچے مکان سے باہر نکلا۔ وہ دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اُس وقت بھواری گائے اسے للی ہی کی طرح کچھ کہتی ہوئی محسوس ہوئی۔ 'اِس گائے کو میں نے پہلے کہاں دیکھا ہے؟' اُسے اپنا خواب یاد نہیں آ رہا تھا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے وہ اپنے تایا سے ٹکرا گیا۔ بوڑھا الدر کسی کام سے جا رہا تھا، ایشار الدین کو بھاگتے دیکھ کر اس نے کہا

"للہ رے کہاں بھاگے جات ہو؟"

لیکن جب ایشار الدین نہیں ٹھہرا تو وہ کچھ سوچ کر الدر گیا۔

اندھیرے میں للی بھوسے پر پڑی ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی، اور پیٹ ننگا تھا۔

بوڑھے نے نزدیک آتے ہوئے کہا

"کون؟ للی!"

پھر وہ اس کے پاس بیٹھتا ہوا بولا

"کیا ہوا رے؟ بول۔ بول نا!"

للی نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور کروٹ لینی چاہی۔ لیکن چوٹ ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور تکلیف کی وجہ سے جسم نے مڑنے سے انکار کر دیا۔

اُسے لگا ایک جملہ اُس کے منہ سے نکلنا چاہ رہا ہے

'کیا میری شادی پوری ہو گئی؟'

لیکن اس خیال کے آنے سے وہ ڈر گئی اور بات کو اپنے سینے میں

دفن کر دینے کے لئے اُس نے اپنے دانتوں سے بازو کے گوشت کو
کس کر پکڑ لیا۔

بوڑھا کچھ دیر خاموش بیٹھا زمین اور بھوسے کو تکتا رہا۔
پھر بے تکے پن سے قہقہے مار مار کر ہنسنے لگا۔ اُس کے بلغم سے
اٹے ہوئے حلق سے نکلتی ہوئی ہنسنے کی آواز اُس اندھیرے چھپر
میں بالکل بے محل لگ رہی تھی۔ گائے بیل تک ڈر گئے، اور للی
نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

بوڑھے نے زمین سے اٹھتے ہوئے کہا
"ہم نے بھید جان لیا۔ ابھی ایشارالدین کے باپ سے کہتا ہوں
دونوں بالک سیانے ہوگئے ہیں"۔

دور ایشارالدین کھیتوں کی منڈیریں پھلانگتا بھاگا جا رہا تھا۔
دو ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا، اُس کا تایا یا کوئی اور اسے
بلانے تو نہیں آ رہا۔ اُس وقت اُس کی آنکھیں پاگلوں کی ایسی
چمک دار تھیں۔ ایسا لگتا تھا شیطان کو فرشتوں نے آگ کا گولا
پھینک کر مارا ہے، اور ایشارالدین اِس بڑے آسمان میں جیسے دنیا
کہتے ہیں ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح بھاگ رہا تھا۔

(۳)

اس واقعے کے مہینے بھر بعد جب ایشارالدین کی بیوی کی
نعش گھر کے کنوئیں سے نکالی گئی تو یہ بات گاؤں بھر میں پھیل
گئی کہ، اُس نے لاج کے مارے خودکشی کرلی ہے!

بہت سے لوگ، کہتے ہیں وہ ایشارالدین کی غیر حاضری کے زمانے
میں خاصی بدچلن رہی تھی اور اُس کی واپسی پر پیٹ سے بھی

تھی! کیوں کہ سب کو اسکا رات گئے تک گلیارے میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنا یاد تھا۔

بعضوں کا خیال ہے اس کا جسم بداعمالیوں کی وجہ سے پک رہا تھا اور اسی وجہہ سے وہ بیٹھ کر کام بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اصلیت جو کچھ بھی ہو رسول پور کے راسخ الاعتقاد لوگوں نے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ خودکشی ہر حال میں حرام موت سمجھی جاتی ہے!

ایشارالدین بھی اپنی بیوی کی نمازِ جنازہ میں شریک نہیں ہوسکا۔ صرف گھر کے چند مرد، جن میں اسکا تایا بھی شامل تھا، للی کو کھاٹ پر ڈال کر بغیر نہلائے دھلائے رات کے اندھیرے میں کہیں لے گئے۔ ایشارالدین سے ساتھ چلنے کے لئے کسی نے نہیں کہا۔

کچھ دن بعد جب وہ دوسرے جہاز پر سائن کرلے کے لئے گھر سے نکلا تو لوگ اُسے دور تک چھوڑنے کے لئے آئے۔

جانوروں کے چھپر کے پاس سے وہ بغیر نظریں اونچی کئے گذر گیا لیکن جب وہ لوگ قبرستان کے برابر سے گذرے تو ان کے سوالوں کا ہاں نہ میں جواب دیتے ہوئے ایکبارگی ہمت کرکے اُس نے اُس اور نظر دوڑائی

وہاں وہی پرانی قبریں تھیں۔

قبرستان میں اِدھر اُدھر بکریاں چر رہی تھیں اور ایک قبر پر چڑھی ہوئی بکری کی پچھلی ٹانگوں کے بیچ میں گردن ٹیڑی کرکے سر گھسائے کوئی لڑکا دودھ کی پھوہاریں اپنے منہ میں ڈال رہا تھا۔ پھر سب کو دیکھ کر گالوں پر سے دودھ پونچھتا اور خفت کی ہنسی ہنستا ہوا وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

پھر وہ جا کر اُن لڑکیوں میں مل گیا جو دور اِملی کے پیڑ کے نیچے کھیل رہی تھیں۔
ایشارالدین جانتا تھا اُن میں سے بیشتر مالکی جا چکی تھیں، کچھ کا گونا بھی ہو چکا تھا اور جب وہ جہاز سے سائن آف کر کے ماہ دو ماہ کے لئے اگلے سال گھر آئیگا تو اُن میں کچھ جو اِس وقت تک للیاں تھیں اپنے گھر کی ہو چکی ہونگی۔

⊙

للی

ماہنامہ افکار، کراچی۔ مارچ۔ اپریل ۱۹۶۳ء
افسانہ نمبر ۱۳۹-۱۴۰/۱۹، ۱۱۵ تا ۱۲۶

ہوا بند کیوں ہے؟

پہلی بار جب پہرے والا سپاہی سلاخوں کے باہر سے گذرا تو احمد کو وہ خیال آیا۔ دوسری دفعہ وہ اُسے آواز دینے کو ہوا اور ہونٹ کھول کر رہ گیا۔ اس کے بعد سپاہی نے متواتر کئی پھیرے کئے، لیکن احمد کسی فیصلے پر نہ پہونچ سکا۔ بالآخر جب اس نے آواز دی تو وہ اتنی مدھم تھی کہ جیل کی اُس کوٹھری میں بازگشت بھی نہ پیدا کر سکی ــ جیسی آواز سوتے میں ڈر جانے کے بعد منہ سے نکلتی ہے، بلکہ کوشش کے باوجود نہیں نکلتی۔

کوٹھری کے باہر بجری کٹی ہوئی سڑک پر کہرا چھایا ہوا تھا۔ دور سے، دور ہوتی ہوئی فل بوٹوں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ اگر کوٹھری کے باہر سائبان نہ ہوتا تو چاند بذاتِ خود نظر آ جاتا۔ لیکن اب صرف اس کی چھایا احاطہ نگاہ میں آتی تھی،

اور سڑک پر درختوں کے سائے کے چلنے سے پتہ چلتا تھا کہ آسمان پر بادل بھاگ رہے ہوں گے۔ باوجود کان لگا کر سننے کے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ لوگ ابھی جاگ رہے ہیں یا سو گئے۔

جیل میں لوگوں کو کام ہی کیا ہوتا ہے جو رات گئے تک جاگیں۔ جو باتیں، جو کتھا کہانی سنائی ہوتی ہے وہ بہت پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ قیدی سر شام سو جاتے ہیں۔ سنتری جاگتے ہیں اور اکتائے سے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے وہ محرر جس نے آخری خانہ پری کی تھی ابھی جاگتا ہو اور لیمپ کے پاس سر نہوڑائے اونگھ اونگھ کر کچھ لکھ رہا ہو۔ لیکن وہ جگہ یہاں سے دور تھی۔ زندگی کی اکیلی پہچان اس وقت کتوں کے بین پر مشتمل تھی — جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔

ایک بار پھر سے بھاری بوٹوں کی چرچراہٹ نزدیک آنی شروع ہوئی۔ ایکا ایکی گھپ اندھیرا چھا گیا، اور ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا احمد کے جسم کو چھوتا ہوا گذرا جیسے اندھیرا پڑے قبرستان سے گذرتے ہوئے کسی نے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے جسم کو پیچھے سے آ کر چھو دیا ہو۔ 'کوئی پل جا رہا ہے کہ بارش شروع ہو جائے گی اور سپاہی اپنی کابک میں جا چھپے گا۔'

احمد نے گھبرا کر فیصلہ کر ڈالا

اُس نے ٹھنڈی سلاخوں میں سے اپنے سر کو باہر نکالتے ہوئے زور سے آواز دی

"دیکھو۔ بات سنو!"

دوسرے ہی لمحے اس نے محسوس کیا فاصلہ تھوڑا تھا، اتنی اونچی آواز کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ الفاظ مصنوعی سے تھے۔

سپاہی نے ٹھٹھک کر پوچھا ”کیا ہے؟“

”مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے“۔

”ڈر! تمہیں؟“

”ہوں“ احمد نے سلاخیں پکڑے پکڑے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”پھر؟ کیا حکم ہے؟ تاشے باجے بجواؤں؟ تمہاری بھابی کو بلواؤں؟“

احمد نے آخری جملے کو ان سنا کرتے ہوئے پوچھا

”باہر کہر ہے نا؟“

”ہونہہ کہر!“ سپاہی نے بندوق دروازے سے تھوڑی ہٹا کر دیوار سے ٹیکتے ہوئے کہا۔ ”بارش ہونے والی ہے، کہ کہر ہے“۔

”مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے“۔

”تو پھر کیا کروں۔ ناچوں؟ گاؤں؟“ سپاہی نے پنڈلیوں پر پھیلے ہوئے رگوں کے جال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ رہا۔ بس اکیلے سے جی گھبراتا ہے“۔

”تو پھر ڈھول ڈھمکا کہاں سے آئے؟“ سپاہی نے کہا۔

”یہ جگہ سب سے الگ تھلگ کیوں ہے؟“

”جیل میرے مشورے سے نہیں بنی تھی۔ جی چاہے تو سپرڈنٹ صاحب سے پوچھ لینا“۔

”مجھے بارک میں کیوں نہیں لے چلتے؟“

”میں داروغہ ہوں کہ کیوں نہیں لے چلتے؟“ سپاہی نے بندوق اٹھاتے ہوئے کہا۔

احمد زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس خیال سے کہ مبادا وہ کچھ اور کہے سپاہی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

پھر ڈرتے ڈرتے احمد نے کہا
"مجھے یہاں ڈر لگتا ہے"۔
"پھر وہی بات۔ ڈر لگتا تھا تو جیل کیوں آئے؟" سپاہی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
"تم تھوڑی دیر یہاں ٹھہر جاؤ، مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے"۔
سپاہی نے دور جاتے ہوئے کہا "مجھے تم سے ڈر لگتا ہے"۔
اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔

ڈیوٹی روم میں محرر نے زور سے چائے کی آخری چسکی لی اور پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولا
"وہی لڑکا جس نے اپنی بھابی کو قتل کیا ہے؟ — چائے کچھ ٹھنڈی تھی آج"۔
"پچھلے سال اُسی کوٹھری میں میں نے ایک آدمی کو دہشت سے مرتے ہوئے دیکھا تھا" پہرے کا سپاہی بولا۔ "رات کو میں گشت کر رہا تھا، پچھلے پہر چیخنے کی آوازیں آئیں۔ جب ہم بتی لے کر گئے تو وہ اینٹھا ہوا پڑا تھا، ناخن جنگلی کبوتر کے رنگ کے تھے، اور باچھیں نیچے کو کھنچ گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم میرے سامنے ہوا تھا — سن رہے ہو یا نہیں؟"

"سن رہا ہوں" محرر نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سوائے اِس کے کہ اُس کے پیٹ میں کیچوے بھرے پڑے تھے اور کچھ نہیں ملا۔ کیچوے بھوک سے بلبلا رہے تھے، کم سے کم اُن کے بجبجانے سے تو ایسا ہی دکھائی پڑتا تھا۔"

محرر بڑے عاقلانہ انداز میں بولا "لوگ کہتے ہیں اندھیرے

میں انسان کو اپنا آپ نظر آتا ہے۔ جیسے اندھیرا ایک آئینہ ہو اور اُس میں پچھلی تمام برائیاں، سارے گناہ صاف دکھائی دیں۔ دن ہوتا ہے تو دوسرے ہی دوسرے۔ دیکھتے ہیں، دوسروں پر غصہ آتا ہے، اپنا آپ غائب ہو جاتا ہے۔ روشنی سے ضمیر چندھیا جاتا ہے۔

عام آدمی ہو سکتا ہے جب اکیلا ہو اور اندھیرے میں، تو اُس کا دل دہشت سے پھٹ جاتا ہو۔ اِن ہتھیاروں کو اپنا آپ نظر آتا ہے لیکن ان کے دل نہیں پھٹتے۔ ورنہ اِتنے آدمیوں کو روز پھانسی دے کر نہیں مارنا پڑتا۔ اُسے ڈر ور کچھ نہیں لگ رہا ہے، اپنا آپ نظر آ رہا ہوگا۔

— یار تمہارے سگریٹ میں سے ہمیشہ چنبلی کے تیل کی بوُ آتی ہے۔"

"اس لڑکے کو اندھیرے میں اپنا آپ نظر آتا ہو یہ بات ٹھیک نہیں ہے" سپاہی نے محرر کے سامنے والی کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو اُس کے داڑھی بھی ٹھیک سے نہیں نکلی ہے"

"داڑھی کا قتل سے کوئی رشتہ نہیں: جن کے داڑھی ہوتی ہے وہ بھی قتل کرتے ہیں، جن کے نہیں ہوتی وہ بھی" محرر نے معمرانہ انداز سے جواب دیا۔

سپاہی نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "میرا مطلب عمر سے ہے بھیا۔ تم خود سوچو اس کی عمر کیا ہے۔ سترہ یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ۔ اٹھارہ برس کا تھا تو میں اپنی عورت کو اپنی بیوی کہتے ہوئے شرماتا تھا"۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

سپاہی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں پچھتاوے کی بات کر رہا تھا" محرر نے بے رحمی سے کہا۔ "پچھتاوا اُنہیں ہوتا ہے جن کا دل معصوم ہو!"

"میں بھی پچھتاوے کی بات کر رہا ہوں۔ پچھتاوے کی بھی عمر ہوتی ہے" سپاہی نے چڑ کر کہا۔

"اچھا جاؤ پہرے پر جاؤ" محرر نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور آنکھوں پر پانی کا چھپکا مارنے چلا گیا۔

کمرے سے باہر نکل کر سپاہی نے دیکھا بارش ہو کر تھم چکی ہے اور جیل کی سڑکوں پر کیچڑ کھڑی ہے۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ محرر دن رات اردو کے رسالے پڑھ پڑھ کر اپنے ساتھیوں کے سامنے دون کی لیتا تھا۔ وہ خود شعر کہتا تھا اور اچھا شعر سن کر داد بھی اونچی آواز میں دے سکتا تھا۔ اس وقت سپاہی کو اُس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ پچھتاوے کے اِس بے رحم تجزیے نے اسے بڑے کٹھور روپ میں اجاگر کر دیا تھا۔

جس کوٹھری میں احمد تھا وہ جگہ سب سے الگ تھلگ تھی۔ اس کوٹھری کی پشت پر وہ نالہ کھلتا تھا جس کے منہ پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ بادل پھٹ گئے تھے اور چاند، پورنماشی کا پورا چاند، بڑی تیز رفتاری سے آسمان میں بھاگ رہا تھا۔ ہوا کے سوا ساری کائنات حرکت میں تھی۔ یہی آخری چیز تھی جسے سوچ کر سپاہی نے احمد کی کوٹھری کی طرف جانے کا ارادہ تقریباً ترک کر دیا۔ ہوا کے نہ ہونے نے!

اسے معلوم تھا اس وقت اگر وہ احمد کی نظر پڑ گیا تو اس کا پہلا سوال ہوگا

''ہوا بند کیوں ہے؟''

بارش سے نہائی ہوئی سڑک پر چلتے ہوئے سپاہی نے کوٹھریوں کے اندر نگاہیں گڑھو کر دیکھا۔ مٹیالے کمبل اوڑھے کچھ قیدی سو رہے تھے۔ کہیں ہر گھپ اندھیرے میں بیڑی کا جلتا ہوا سرخ سرا ایک بار نیچے غوطہ کھا کر دوبارہ اوپر لوٹ آیا۔ تب ہی ایک مری مری سی آواز آئی

''آج ہوا کیوں بند ہے؟'' جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ہو۔

''یہ تو حضرت میکائیل سے پوچھو'' سپاہی نے دلچسپی لیتے ہوئے قدرے توقف سے کہا۔

''شاید بارش کی وجہ سے ہوا ٹھہر گئی ہے'' احمد نے لجاجت سے کہا۔ ''بارش ہوئی ہے نا! بارش کے بعد عام طور سے ہوا رک جاتی ہے''۔

''جب تمہیں ہر بات کا جواب خود معلوم ہے تو مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہو۔ لیٹ کر سو رہو۔ میرا وقت کیوں برباد کرتے ہو؟''۔

''وقت کیسے برباد کر رہا ہوں بھائی؟ مجھے معلوم ہے بارک میں کوئی خطرناک قیدی نہیں ہے۔ دوسری کوٹھریاں تین چار دن سے خالی پڑی ہیں۔ صبح ہی جمعدار سے میں نے پوچھا تھا یہاں کون کون خطرناک قیدی ہیں؟ جو سب سے خطرناک قیدی ہے وہ میں ہوں۔ پھر اگر تھوڑی دیر، چاہے اپنی بندوق ہی لئے، تم میری کوٹھری کے سامنے ٹھہر گئے تو کیا ہوا۔ اس طرح وقت اچھا گذر جاتا ہے''۔

سپاہی نے بوٹ کے تلوے کو کگر سے رگڑتے ہوئے کہا ”وقت تو تمہارا ختم ہی ہو چکا ہے۔ اس کے اچھے یا برے گذرنے کا کیا سوال ہے“۔

پھر اس نے محسوس کیا یہ بات محرر کے کہنے کی تھی۔ ایک آدمی سے — بلکہ ایک لڑکے سے — جس کا وقت ختم ہو چکا ہے یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ خفت مٹانے کے لئے اس نے کہا

”توبہ یہاں کی مٹی کتنی چکنی ہے، ایک بار تلے سے چمٹ جائے چھٹنے کا نام نہیں لیتی“۔

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد نے کہا ”جب تلے سے کوئی چیز چمٹی ہوئی ہو تو چلنے میں عجیب بے چینی سی رہتی ہے۔ جیسے دانتوں میں کچھ پھنسا رہ جانے پر معلوم ہوتا ہے“۔

”یہاں آدمی بے کل ہو جاتا ہے“ سپاہی نے کہا۔

”مجھے یہاں بے حد ڈر لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے جب کوئی آس پاس نہ ہو“۔

”موت کا خیال آتا ہے؟“

احمد خاموش رہا۔

”نہیں؟“ سپاہی نے دیوار سے بندوق ٹیکتے ہوئے کہا ”پھانسی اندھیرے میں سے جھانکنے لگتی ہے؟“

”اوں ہممم“

”پچھلے سال جو آدمی یہاں دہشت سے مر گیا تھا کسی نے اسکی کہانی تمہیں سنائی ہے؟“

”نہیں“

"پھر لیٹ کر سو رہو۔ نیند آ جائے گی"۔

احمد سلاخیں پکڑے پکڑے زمین پر بیٹھ گیا۔ سپاہی نے ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے پوچھا

"احمد آخر سچی بات کیا ہے؟ تم نے اپنی بھابی کو قتل کیوں کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم" احمد نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

"اصلی بات بغیر کسی سے کہے ہی مرجاؤ گے؟"

"پتہ نہیں" احمد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"لوگ کہتے ہیں تمہارے بھائی کو اب بھی تم سے بڑی محبت ہے —؟"

احمد خاموش رہا۔

سپاہی نے بیزار ہوکر بندوق اٹھالی اور آگے چل پڑا۔

احمد نے چونک کر کہا "مجھے بے حد ڈر لگ رہا ہے بھائی، یہاں ہوا بالکل نہیں ہے۔ کھڑکی ہوا کے رخ —"

سپاہی نے دور ہوتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تمہارے شمش محل میں نہ روشنی ہے نہ پنکھا"۔

"تھوڑی سی دیر اور ٹھہر جاؤ" احمد نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"میں جاکر پنکھا کھینچنے والے قلی کو بھیجتا ہوں" دور سے سپاہی کی تمسخر آمیز آواز آئی۔ پھر بجری پر بوٹوں کے چلنے کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ جیسا قبروں کے اندر ہوتا ہے، اور وہ سیلن جو سالہا سال سے بے مکین عمارتوں کا خاصا ہوتی ہے۔

سپاہی کے چلے جانے کے بعد احمد پہلے تو کچھ دیر سلاخوں کو پکڑے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر گھبرا کر اس نے اپنی پشت کی طرف کھڑکی کو دیکھا۔ بہت سے سوال ننالیسے کو لہروں کی طرح آگے پیچھے اُس کے ذہن سے ہو کر گذر گئے جن میں پچھلی رات کا خواب بھی تھا۔

لیکن ایسے اندھیرے میں اُس کی اوعمر بھابی نے جس کے پیٹ میں پہلا بچہ تھا اُسے آ کر تنگ نہیں کیا۔ موت جو یقینی تھی اس کا وہ دہشت ناک روپ بھی اس کے سامنے نہیں آیا جسے سوچ کر ہی بہت سے پیغمبر اور فاتح رو پڑتے تھے۔

وہ کون آدمی تھا جو پچھلے سال دہشت سے یہاں مر گیا تھا؟ احمد ایک کونے میں دبکنے لگا، لیکن سلاخوں والی کھڑکی اور سلاخوں والا دروازہ ایسا لگتا تھا چوپٹ کھلے ہوئے ہیں!

پچھلی رات جھپکی آنے پر اُس نے دیکھا تھا اُس کے پتھر جیسے سر میں آر پار ایک سوراخ ہے جس میں سے ایک سانپ باہر کو سر نکالتا ہے۔ احمد نے لکڑی سے جوں ہی سانپ پر وار کیا، سانپ نے اپنا سر اندر کرلیا۔ لکڑی اُسکی کنپٹی پر پڑی۔ درد کی تکلیف سے پتھر کے سر نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

احمد کی آنکھ بھی کھل گئی۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے گردن لمبی کر کے سلاخوں میں سے باہر جھانکا۔ اور دوبارہ گڑمڑی مار کر بیٹھ گیا۔ اِس گھپ اندھیرے میں وحشت تھی۔ اندھیرا نہ قتل کی واردات دوبارہ سنا رہا تھا، نہ پھانسی پانے کے خوف کو اس پر مسلط کر پایا تھا۔ ویسے بھی پھانسی کا جسمانی خوف فی الحال بے معنی تھا، کیوں کہ اُس نے

کبھی کسی کو پھانسی چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔

کہیں ایک اُلو اپنی بھدی موٹی آواز میں دو تین بار چیخا۔ احمد نے اپنے پورے جسم کو سُن ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ یہی اندھیرے کا گم بودگی، بے کلی اور دہشت کا پیغام تھا۔

دھیرے دھیرے کوٹھری میں بھی چاندنی پھیل گئی۔ احمد نے کھڑے ہوکر کھڑکی کی دہلیز پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ ایک جلی ہوئی موم بتی کا، سیمنٹ پر پھیلا ہوا، موم اور ایک پرانا بلیڈ معلوم نہیں کب کی یہ دو چیزیں وہاں پڑی رہ گئی تھیں۔ کئی بار وہ سونے کے لئے لیٹا، اور جوں ہی غنودگی طاری ہونے لگتی آنکھ کھٹکے سے کھل جاتی تھی۔ جیسے کھڑکی کی طرف یہ کوٹھری غیر محفوظ ہے۔ کوئی جھانک رہا ہے۔ کئی بار اٹھ اٹھ کر وہ دروازے کی سلاخوں تک آیا۔ کتنی ہی بار وہ کھڑکی تک گیا — جس طرح بچے رات کو پلنگ سے نیچے پیر رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں اور ڈر کے باوجود کبھی کبھی لٹک کر نیچے جھانکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

صبح جب سپاہیوں نے آ کر اسے دیکھا تو اُس کے ہاتھ کھڑکی کی سلاخوں کو مٹھیوں میں بھینچے ہوئے تھے۔ ناخن جنگلی کبوتر کے رنگ کے تھے۔ باچھیں نیچے کو جھک گئی تھیں، اور اس کا جسم اینٹھا ہوا تھا۔ بے نور آنکھیں کھڑکی کے باہر نالے کی طرف گھور رہی تھیں۔

صبح کے دس بجے احمد کا پوسٹ مارٹم پیر بخش نے کیا جو

اِس سے پہلے اُس کی بھابی کا پوسٹ مارٹم بھی کر چکا تھا، اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ لاش پر چاقو چلاتے ہوئے اُس کے کان ڈاکٹر اور پولیس کے سپاہی کی گفتگو پر رہتے ہیں۔ ہر پوسٹ مارٹم کا مطلب اُس کے نزدیک ایک نئی کہانی ہوتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں اگر اس کا بس چلے، تو وہ کہانی کے فراق میں پورے شہر کو پوسٹ مارٹم کی میز پر لا لٹائے۔

جیل کے محرر نے کہا "تعجب ہے اس لڑکے کے پیٹ سے بھی کیچوے نکلے!"

ایک بڑھیا نے جو اپنے کسی رشتے دار سے ملنے آئی تھی کہا "آٹے میں مٹی ملی ہوتی ہے بھیا۔ جب پیٹ میں مٹی ہوگی تو کیچوے آپ ہی رہویں گے"۔

ساڑھے دس بجے ایک لمبا تڑلنگا آدمی لاش لینے اکیلا آیا اور بیل گاڑی پر لاش کو لاد کر چلا گیا۔ لاش پر پڑی ہوئی خشک گھاس گاڑی سے دور تک گرتی چلی گئی کیوں کہ ہوا تیز تھی۔

لوگوں نے کہا وہ مرنے والے کا بڑا بھائی تھا جس کی بیوی کو مرنے والے نے قتل کیا تھا۔

گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا اور وہ آدمی بیلی کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔

کہا جاتا ہے، قتل کی وجہ اسے معلوم تھی۔

لدیدی -

کچھ لوگ کہتے ہیں: نہیں، صحیح وجہ اسے بھی نہیں معلوم۔
لیکن اس بات کی اہمیت ہی کیا ہے؟

○

ہوا بند کیوں ہے؟
ماہنامہ افکار، کراچی۔ فروری ۱۹۶۳ء
۱۳۸/۱۸، ۴۷ تا ۵۲

ندیدی

چندا کی نظر بہت بری تھی۔

جب کھانے پینے کا وقت نہ ہو، اور وہ کسی کے گھر چلی جائے تو بن آموں کے باغ میں کوئل آ جاتی تھی جیسے اس کی مدہر آواز، معصوم صورت اور کووؤں کے ڈر سے چوکنی لیکن من بھاونی آنکھوں کی بنا پر رکھوالا نیچے لیٹا ایک ٹک دیکھا کرتا ہے۔ پر یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ اپنے ندیدے پن کی وجہ سے جاتی ہمیشہ ایسے وقت تھی جب حاجی جی کا پورا کنبہ باورچی خانے میں بیٹھ چکا ہوتا تھا یا خورشیدہ دھوپ میں چوکی پر بیٹھی اڑد کی کھچڑی بڑے چاؤ سے کھا رہی ہوتی یا آجو نے ابھی ہنڈیا سے پتن کے لئے دودھ انڈیلا ہوتا یا کچھ اور۔

ایسے موقع پر مالی کو سوچھنا پرکھنے کی سدھ بھول جاتی

کچھ لوگ کہتے ہیں: نہیں، صحیح وجہ اسے بھی نہیں معلوم۔
لیکن اس بات کی اہمیت ہی کیا ہے؟

○

ہوا بند کیوں ہے؟
ماہنامہ افکار، کراچی۔ فروری ۱۹۶۳ء
۱۸/۱۳۸، ۴۷ تا ۵۲

ندیدی

چندا کی نظر بہت بری تھی۔

جب کھانے پینے کا وقت نہ ہو، اور وہ کسی کے گھر چلی جائے تو بن آموں کے باغ میں کوئل آ جاتی تھی جیسے اس کی مدھر آواز، معصوم صورت اور کوؤں کے ڈر سے چوکنی لیکن سن بھاولی آنکھوں کی بنا پر رکھوالا نیچے لیٹا ایک ٹک دیکھا کرتا ہے۔ پر یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ اپنے ندیدے پن کی وجہ سے جاتی ہمیشہ ایسے وقت تھی جب حاجی جی کا پورا کنبہ باورچی خانے میں بیٹھ چکا ہوتا تھا یا خورشیدہ دھوپ میں چوکی پر بیٹھی اڑد کی کھچڑی بڑے چاؤ سے کھا رہی ہوتی یا آجو لے ابھی ابھی ہنڈیا سے پتن کے لئے دودھ انڈیلا ہوتا یا کچھ اور۔

ایسے موقع پر مالی کو سوچھنا پرکھنے کی سدھ بھول جاتی

ہے۔ پھل جو کتر گئے تو کوئل پادا کھنے پر بھی نہ بکیں گے۔ ایسی سندرتا کس کام کی جس سے گھاٹے کے سوا کچھ نہ ملے!
اجو نے چندا کو دودھ کی طرف تکتے دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے چوکی پر پیالہ رکھنے کے بعد اس نے دبی آواز میں غصے سے کہا
''پہلے لئی لاف (*) پڑھو پھر پینا''۔

یہی الفاظ نہ جانے کتنی ماؤں نے اُس کے بارے میں اپنے بچوں سے کہے تھے، جنہیں سن کر وہ اُس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاتے یا چیز کو چھپانے کے لئے بے کلی سی محسوس کرتے۔ بعض مائیں جن کے بچے ابھی غوں غاں ہی کرتے ہوتے اُن کی دودھ کی لٹیاں کپڑوں سے چھپا دیتیں۔ خود اپنے مذہب کا اپنے خلاف یہ جہاد اُس نے بچپن ہی سے محسوس کر لیا تھا۔

'پتن کو بسکٹ دیکھ کر اُنہیں دودھ میں چورنے کی ایسی چاہ ہو رہی تھی کہ وہ دھوپ سے بھرے دالان کے اندھیرے سرے پر تھم سے لگی کھڑی چندا کو دیکھنا بھی بھول گیا تھا۔ اس نے بے صبرے پن سے کہا
''میں نہیں پڑھتا!''

''پڑھو'' اجو کے بناوٹی غصے میں اب تحکم آ گیا تھا۔ ''بغیر پڑھے نہیں ملنے کا''۔

لحظے بھر کو اپنی بھوک بھول کر اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں، یہ بے وجہ رعب کیوں؟ کیا اُس کی ماں اُسے سبق یاد رکھنے کے معاملے میں اتنا ہی بدھو سمجھتی ہے کہ موقع بے موقع اُس سے سبق دھروایا جائے!

---

* لا الہ الا اللہ

لیکن اجو خود آنکھیں بند کئے زیرلب وہی سورت پڑھ رہی تھی۔
تب ایک دم اُس سیانے بالک نے پوری پہیلی بوجھ لی۔ اُلٹے ہاتھ
کو نظر دوڑانے پر اُسے چندا نظر پڑی۔ جوتیاں پھینک کر کسی
انجانی مسرت سے چوکی پر چڑھتے ہوئے اس نے فرانٹے سے ”بد بد،
بد بد آیت پڑھنی شروع کردی۔ لیکن 'امنھم من خوف، تک پہنچنے
سے پہلے پہلے وہ اپنی ماں کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔

جب اجو کو آیت ختم کرلینے کے بعد بھی تحفظ کا احساس
نہیں ہوا تو اُس نے گنجینے میں سے ایک جلا ہوا بسکٹ نکالا اور
دل پر جبر کرکے اُسے چندا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر یہ اطمینان
ہو جانے پر کہ چندا کی نظر اب اُس کے پتن کا کچھ نہیں بگاڑ
سکتی وہ دونوں بچوں کو دالان میں چھوڑ کر خود باورچی خانے
چلی گئی۔

چندا کے باپ کی نظر جب وہ زندہ تھا اور بھی زیادہ
بدنام تھی۔

بابو ست نرائن، پینٹھ سے گائے خرید کر لا رہے تھے۔ بڑی سجیلی
دودھیلی گائے تھی۔ راستے میں حافظ جی ملے آداب عرض تک نہ
ہوئی۔ بشمبو ملے اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے لیکن گائے کی طرف
آنکھ بھر کے نہ دیکھا۔ ایک اور مہاشے بولے بھی تو صرف اتنا
”کتنے کی لی؟“۔

چندا کا باپ بُدھا البتہ انہیں دیکھ کر رک گیا۔ دیر تک گائے
کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ گھر آکر بابو صاحب، سوائے اُس
اکیلے غریب کے، سب کے شاکی تھے کہ حسد کے مارے چھوٹے
منھ سے ایک کلمہ تحسین کا نہ نکلا۔ لیکن جب اگلے ہی دن

مرتی ہوئی گائے کو بوچڑ آ کر لے گیا تو انھیں پتہ چلا وہ سب خیرخواہ تھے: نظر نہ لگانا چاہتے تھے۔ اِس کی تعریف میں بس تھا سو وہ اُنڈیل گیا۔

یہ بات اُڑتی اُڑاتی ہندواڑے سے چندا کے اپنے محلے تک بھی پہنچ گئی۔

ایک دن بدھا رمنگا کے گھاٹ پر گڑگڑی لئے دو چار اور لوگوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ندی میں پانی تھوڑا تھا۔ دوسری طرف سے جو گاڑی بان بہلیاں پانی میں اتارے لئے آ رہے تھے اُن میں ایک ایسا آدمی بھی تھا جس کے پاس پہلے کبھی بیل نہ تھے۔ آج وہ گاڑی جوتے بڑے پرتاپ سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ لوگ اُسے آوازیں دینے لگے۔ لیکن آدھی دور تک آنے کے بعد اچانک اس نے بیلوں کا رخ موڑ دیا۔ بات کسی کے پلے نہیں پڑی کہ اس نے کیوں ایسا کیا۔

کسی کی اس سے ناچاقی نہ تھی، ہور نہ تھا پھر یہ آنکھ بچا کر نکل جانا کیا معنی رکھتا تھا؟ تب ایک بوڑھے گھاگ نے معنی خیز نظروں سے بدھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا

”بسے چارے نے گوئیں نئی ہی خریدی ہے نا!“

اس کے بعد کافی عرصہ تک بدھا کو کسی بھی چیز کی تعریف کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ خود چندا کو جو اُن دنوں بالک ہی تھی لگتے ہوئے اُسے بھئے آتا تھا کہ کہیں اُس کی آنکھوں پر چھدا رکھتے ہوئے مشیت کچھ کر کرا نہ بیٹھے۔

اُنھیں دنوں حاجی جی نے نئے شہتیر ترائی کی طرف سے منگائے تھے۔ اُنھیں دیکھنے کے لئے اُن کی ہاں میں ہاں ملانے والے اُمنڈ پڑے۔ کوئی لکڑی کی مضبوطی کی بڑائی کرتا تھا تو کوئی

دیمک سے محفوظ ہونے کو سراہتا تھا۔ آنے والوں میں کچھ بیوپاری بھی تھے، حاجی جی اُن کے سامنے گھمنڈی بنے کھڑے تھے۔ ایک کو شیشے میں اتارنے کے لئے چندا کے باپ سے بولے

"کیوں بدھا! تم تو مجھے تیس سال سے کاروبار کرتے دیکھ رہے ہو، ایمان داری سے بتانا ایسے شہتیر کبھی پہلے بھی دیکھے تھے؟"

پھر اِدھر اُدھر کھڑے لوگوں کی توجہ کو تسخیر کرنے کے لئے انہوں نے آواز ذرا بلند کرتے ہوئے کہا "اور جب میرے یہاں نہیں دیکھے تو پھر اور کہیں دیکھنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کیوں۔ بدھا؟"

بدھا گڑ بڑا گیا، کیا کہے۔ ہنکلاتا ہوا بولا "کوئی خاص تو نہیں، حاجی جی۔ کیا رکھا ہے اِن میں!"

اجو کو آٹا گوندھتے ہوئے یہی باتیں یاد آ رہی تھیں لیکن اُن میں وہ ہنسی اور لطف شامل نہ تھا جو سردیوں کی راتوں میں اِنھی باتوں کو سکھیوں سے سنتے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔ اِس وقت اِن میں کڑواہٹ اور مجبوراً ایک بسکٹ دینے کا افسوس تھا۔ وہ کہانی تھی یہ اپنے پر ہو بیتی۔

دو چار بار ایسا بھی ہوا کہ خورشیدہ کی چھوٹی بہن کو دودھ پلوایا جا رہا ہے کہ چندا وہاں جا پہنچی۔ ظاہر ہے وہ جس کام سے آئی ہے محض اسے کر کے ٹل جانا دنیاداری نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر جم ٹھس ہو کر رہ جاتی۔ اِدھر اُدھر کی ہانکتی۔ دوردراز کے رشتے داروں کے بارے میں پوچھتی مثلاً

"فیض آباد والے ماموں اتنے دنوں سے کیوں نہیں آئے؟"

"چھٹی نہیں ملی ہوگی"

"اور اُن کی بیوی کیسی ہیں؟"

"اُن کی بیوی! کونسی بیوی؟"

"وہی"

"اچھا وہ!"

"ہوں"

"ٹھیک ہے لچھمی"

مگر اتنی ذرا سی بارش میں جیسے گنگا بپھر کر اپنا راستہ بھول جاتی، بوبا اوکنے لگتیں، دنیا تلپٹ ہوجاتی اور خورشیدہ کی ماں کی نظریں حضرت موسیٰ کے جلال کا سماں باندھ دیتیں۔ چندا کو ہمیشہ شرمندہ ہوکر اپنے گھر جانا پڑتا تھا۔

چندا اندھیرے میں تھم سے لگی کھڑی یہی سوچ رہی تھی۔ لیکن خود اس کی ماں نے کسی کو گھر میں آتے دیکھ کر کبھی کوئی آیت حفظ ماتقدم کے طور پر نہیں پڑھی تھی! اور بن آیتوں سورتوں کے بھی سب کا ہاضمہ درست تھا، ’ہیں ہی کمینے۔ میرے باپ کو بھی بدنام کیا تھا، سجھے بھی کرتے ہیں۔ دنیا زمانے کے خسیس۔ تب ہی تو پچتا نہیں کچھ پیٹ میں۔ جلا ہوا بسکٹ دے کر بڑا احسان کیا ہے‘۔ ایسا غصہ چندا کو کبھی پہلے نہ آیا تھا۔ آج وہ پتن کے ساتھ کھیلے بغیر اپنے گھر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب اجو دالان میں لوٹی تو اس نے دیکھا، وہ بسکٹ چوکی پر پڑا ہے۔ کچھ دیر تک وہ بھونچکا سی کھڑی رہی۔ ملنے کے بعد چھوڑ جانا، اِس کا مطلب؟ پھر اس نے کچھ سمجھتے ہوئے وہ بسکٹ اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دوبارہ ڈبے میں رکھ لیا۔ چندا کے بڑے ہوجانے کا احساس اُسے آج سے

پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

اجو سیدالی تھی، چندا جلاہی۔ عمر میں چندا پتن سے سیانی تھی، سنجیدہ چتور اور جذبات آشنا۔

(۲)

یہ جیٹھ کی بات ہے۔

ایک دن جب چندا پتن کے ساتھ بھولا کی چکی پر پہنچی تو سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ جن لوگوں کو گیہوں پسوانے تھے ان کی بھیڑ نمبر دینے والے کو گھیرے ہوئے تھی۔

"کہاں رکھوں؟" چندا نے بوری کے بوجھ تلے دبے دبے پوچھا۔

آج گھر پر کسی بڑے مرد یا نوکرانی کے نہ ہونے کی وجہ سے پتن کی ماں نے پیسے کا لالچ دے کر چندا کو آٹا پسوانے بھیجا تھا اور وہ اتنی دور دھوپ میں چل کر آنے سے پسینے میں نہا سی گئی تھی۔

چکی پر چڑھے ہوئے ایک مزدور نے، جو اُس میں بوریوں میں سے اناج لوٹ رہا تھا، وہیں سے کھڑے کھڑے ڈانٹنے والے انداز سے کہا "رکھ کیوں نہیں دیتی ہے نیچے۔ کھڑی کھڑی وہیں سے باتیں بنا رہی ہے، 'کہاں رکھوں، کہاں رکھوں'۔ سیر وہ کرمچ والی بوری دے دے، وہ جو ––"

لیکن بات ابھی بیچ میں ہی رہتی تھی کہ بھولا کا لڑکا دوکان میں سے اُٹھ کر چکی والے کوٹھے میں کسی کام سے آیا اور چکی والے مزدور سے باتیں کرنے لگا۔

چندا نے بوری ایک دھماکے سے کھڑے قد سے زمین پر پھینکی

اور چھت میں لگے ہوئے پنکھے کے نیچے کھڑی ہو کے ہاتھ جھاڑنے لگی۔ بھولا کے لڑکے نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ گیہوں میں سے چھنے ہوئے آٹے سے اس کے بال سفید ہو رہے تھے اور ہوا میں درختوں پر سے لٹکتی ہوئی بیلوں کی طرح اِدھر اُدھر لہرا رہے تھے۔ دھوپ میں چل کر آنے سے اس کی مت اس بری طرح کٹی تھی کہ ہوا لیتے ہوئے اُسے اِس بات تک کا خیال نہیں تھا کہ اُس کا دوپٹہ کہاں پہنچ چکا ہے۔ پسینہ سکھانے کے لئے وہ اپنا گریبان اپنی انگلیوں سے سینے پر پھٹپھٹا رہی تھی اور اس میں پھونکیں بھی مارتی جاتی تھی۔

بھولا کے لڑکے نے سب کچھ بھول بھال کر اسے بدمست نظروں سے دیکھا۔

ابھی تک اس کے پوری داڑھی نہیں نکلی تھی اس لئے مزدور اُس کے منہ چڑھے ہوئے تھے اور چھیڑ بیٹھنے تک سے گریز نہیں کرتے تھے۔

”ہما پور تھوڑی ہی سی تلو میں ٹپکنے لگتا ہے۔“ کسی نے کہا شرم کی وجہ سے اُس نے آگے بڑھ کر چکی کے منہ پر سے کپڑا ہٹایا اور بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے آٹے کی دھار کو انگلیوں پر لیتے ہوئے رک رک کر بولا

”سہین بہت ہے، شام تک کام پورا نہیں ہولے گا“۔

پہیہ گھمانے سے ایکا ایکی چکی زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ شور بھی بڑھ گیا۔ زمین جو پہلے ہی من من بھر کے بوجھوں کی اٹھا پٹخ سے دہل رہی تھی اب اور بھی کسی جاڑے کے مریض کی طرح کپکپانے لگی۔

اس بیچ میں چندا نمبر لگوانے کے لئے بھیڑ میں گھس چکی تھی۔ ہر باری کے انتظار میں اُکتائے ہوئے لوگوں نے اُسے وہ

اہمیت نہ دی جو اِس عمر میں لڑکیوں کا ہاتھوں والا خراج ہوتی ہے۔ مہاجن قرضہ دیتا ہے تو کچھ آگا پیچھا دیکھ کر دیتا ہے، یوں ہی نہیں۔ اب اُس کی اوڑھنی الڈوں پر بیٹھی ہوئی چڑیا کی طرح اُس کے سینے کو چھپائے ہوئے تھی۔ پھر بھلا کوئی اُس کے لئے راستہ کیوں چھوڑتا!

آگے بڑھنے کی کوشش میں نہ جانے اس نے کتنوں کو دھکے دیئے اور نہ معلوم کتنی بار اپنی بوری پر پہلے نمبر لگوانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ نمبر لگانے والا آدمی جھلا گیا اور ادبدا ادبدا کر اُس نے دوسروں کا کام پہلے کرنا شروع کردیا۔ کچھ دیر تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔

پتن اِس بھیڑ بھڑکے سے علیحدہ کھڑا باہر بندھے ہوئے ایک ٹٹو کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ چندا نمبر والے کے دھیمے سے ایک تو پہلے ہی جل رہی تھی اب پتن کی یہ بے نیازی دیکھ کر اور بھی بھڑک اُٹھی۔ عمر میں وہ اس سے خاص چھوٹا نہ تھا۔ دو پیسے یا اکنی، یہی نا! مگر روٹیاں تو پتن اور اس کے گھر والے ہی کھائیں گے اور اُسے دیکھ کر پیٹھ موڑ کر آیتیں پڑھنی شروع کردیں گے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ غصے سے بڑبڑاتی باہر نکل آئی۔

اُسی وقت بھولا کے لڑکے نے چکی سے فراغت پائی تھی اور اب وہ کھڑا ہاتھ جھاڑ رہا تھا۔ چندا کو باہر نکلتی دیکھ کر اس نے میٹھا بنتے ہوئے پوچھا

"کیا ہوا ری؟"

"کچھ نہیں"۔

"کچھ نہیں؟ پھر منہ کیوں بناوے"۔ اُسے وہ پہلے والا سماں اب تک نہیں بھولا تھا کہ بال کھلے ہوئے ہیں دوپٹہ جانے بے جا، وغیرہ وغیرہ۔

چندا نے ابھی تک موقع کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ سوچ رہی تھی کیوں نہ اِکنی پر لات مار کے واپس جا کر کہ دیا جائے کہ چکی پر بھیڑ بہت ہے، مردوں کے کرنے کا کام ہے۔

بھولا کے لڑکے نے ایک دم پکار کر کہا

"چھوٹے ایک چٹ دے مجھے" اور پھر چندا سے بولا

"آج تو نہیں ملنے کا۔ کسی کی باری نہیں آئے گی"۔

"پھر کب؟" چندا کھوئے کھوئے سے لہجے میں جیسے دور کی آشا کی ایک ناؤ کو ٹاپو کی طرف آتے دیکھ کر بولی۔

"کل صبح۔ چھوٹے چٹ دے ایک، اور ہاں نمبر بھی بول دے"

"باون" نمبر لکھنے والے آدمی نے بغیر سر اٹھائے جواب دیا۔

کھوئی ہوئی اِکنی خود سے دوبارہ پاجانے کی خوشی میں اس نے سانس روکتے ہوئے کہا

"اچھا تو کل ہی سہی"۔

بھولا کے لڑکے نے اودے رنگ سے بوری پر ۵۲ لکھا اور پرچی لکھتے ہوئے چندا کو سنانے والے لہجے میں کہا

"یہ بوری سب سے الگ رکھی جائے گی۔ اسے تم ــ" اور پھر جیسے کسی کام کے پیچھے لکھتے لکھتے وہ اندر والی کوٹھڑی میں چلا گیا۔

چندا کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لیے بوری اٹھائی اور بغیر پوچھنے کو کہ کہاں رکھنی ہے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی

پتن نے جب ٹنّو کی طرف سے گردن موڑی تو اُسے چندا اندر جاتی نظر پڑی۔ وہ اس کے پیچھے چل دیا۔

لیکن جب وہ اندر پہنچا تو اس نے دیکھا چندا زور مار کر بھولا کے لڑکے کے بازوؤں میں سے نکلی اور دوپٹے سے اپنے چہرے کو پونچھتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے پر پہنچ کر اس کے قدم سست پڑ گئے۔ وہاں ٹھہر جانے میں کوئی خطرہ نہ تھا البتہ بھاگنے کی صورت میں بھانڈہ پھوٹ جانے کا احتمال ضرور تھا۔ کچھ دیر وہیں ٹھہر کر اس نے پتن سے شرماتے ہوئے کہا

”لالہ سے پرچی لیاؤ“۔

چند ہی لمحوں میں اتنا کچھ ہو بیتنے سے چندا کی چھاتی بے طرح دھڑک رہی تھی۔ اس نے شور کیوں نہ مچایا تھا یہ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ یہ احساس البتہ اُسے ہو رہا تھا کہ کسی نے پہلی بار آج اُس کا ایک نیا روپ ڈھونڈ نکالا تھا جس سے وہ خود بھی اِس لمحے سے پہلے نا آشنا تھی۔

پتن بھی ٹھیک سے ساری بات نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اُسے بھولا کے لڑکے سے زیادہ چندا کے بات کو چپ چاپ پی جانے پر تاؤ آ رہا تھا۔ اِس میں اُسے خود چندا کی منشا معلوم ہوتی تھی۔

راستے بھر چندا اور پتن خاموش چلتے رہے۔ اور دنوں کی طرح انھوں نے راستے میں کہیں بھی نہ بولیاں بینیں اور نہ ہی کوندلیاں توڑیں۔ چندا کو اپنی خاموشی تو سمجھ میں آ رہی تھی

"کچھ نہیں؟ پھر منہ کیوں بناوے"۔ اُسے وہ پہلے والا سماں اب
تک نہیں بھولا تھا کہ بال کھلے ہوئے ہیں دوپٹہ جانے بے جا
وغیرہ وغیرہ۔

چندا نے ابھی تک موقع کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا تھا۔
سوچ رہی تھی کیوں نہ اِکنی پر لات مار کے واپس جا کر ک
دیا جائے کہ چکی پر بھیڑ بہت ہے، مردوں کے کرنے کا کام ہے

بھولا کے لڑکے نے ایک دم پکار کر کہا

"چھوٹے ایک چٹ دے مجھے" اور پھر چندا سے بولا
"آج تو نہیں ملنے کا۔ کسی کی باری نہیں آئے گی"۔
"پھر کب؟" چندا کھوئے کھوئے سے لہجے میں جیسے دور
آشا کی ایک ناؤ کو ناپو کی طرف آتے دیکھ کر بولی۔
"کل صبح۔ چھوٹے چٹ دے ایک، اور ہاں نمبر بھی بول دے،
"باون" نمبر لکھنے والے آدمی نے بغیر سر اٹھائے جواب دیا۔
کھوئی ہوئی اِکنی خود سے دوبارہ پاجانے کی خوشی میں اس ن
سانس روکتے ہوئے کہا
"اچھا تو کل ہی سہی"۔

بھولا کے لڑکے نے اودے رنگ سے بوری پر ۵۲ لکھا او
پرچی لکھتے ہوئے چندا کو سنانے والے لہجے میں کہا
"یہ بوری سب سے الگ رکھی جائے گی۔ اسے تم—" اور پھر جیسے
کسی کام کے پیچھے لکھتے لکھتے وہ اندر والی کوٹھڑی میں چلا گیا۔
چندا کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لیے بوری اٹھائی اور
پوچھنے کو کہ کہاں رکھنی ہے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی

پتن نے جب ٹٹو کی طرف سے گردن موڑی تو اُسے چندا اندر جاتی نظر پڑی۔ وہ اس کے پیچھے چل دیا۔

لیکن جب وہ اندر پہنچا تو اس نے دیکھا چندا زور مارکر بھولا کے لڑکے کے بازوؤں میں سے نکلی اور دوپٹے سے اپنے چہرے کو پونچھتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔

دروازے پر پہنچ کر اس کے قدم سست پڑ گئے۔ وہاں ٹھہر جانے میں کوئی خطرہ نہ تھا البتہ بھاگنے کی صورت میں بھانڈہ پھوٹ جانے کا احتمال ضرور تھا۔ کچھ دیر وہیں ٹھہر کر اس نے پتن سے شرماتے ہوئے کہا

"لالہ سے پرچی لیاؤ"۔

چند ہی لمحوں میں اتنا کچھ ہو بیتنے سے چندا کی چھاتی بے طرح دھڑک رہی تھی۔ اس نے شور کیوں نہ مچایا تھا یہ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

یہ احساس البتہ اُسے ہو رہا تھا کہ کسی نے پہلی بار آج اُس کا ایک ایسا روپ ڈھونڈ نکالا تھا جس سے وہ خود بھی اِس لمحے سے پہلے نا آشنا تھی۔

پتن بھی ٹھیک سے ساری بات نہیں سمجھ پایا تھا لیکن اُسے بھولا کے لڑکے سے زیادہ چندا کے بات کو چپ چاپ پی جانے پر تاؤ آ رہا تھا۔ اِس میں اُسے خود چندا کی منشا معلوم ہوتی تھی۔

راستے بھر چندا اور پتن خاموش چلتے رہے۔ اور دنوں کی طرح انہوں نے راستے میں کہیں بھی نہ نبولیاں بینیں اور نہ ہی کوندلیاں توڑیں۔ چندا کو اپنی خاموشی تو سمجھ میں آ رہی تھی

لیکن پتن کیوں چپ ہے یہ وہ نہ سمجھ پائی۔ کہیں پٹوانے کے منصوبے تو نہیں بنا رہا ہے؟ اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے پتن کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا

”پتن تمہارے مونچھیں نکل رہی ہیں!“

شاید وہ چاہتی تھی پتن کو جا کر جو کچھ کرنا ہے اس کا ایک حوالہ وہ یہیں دے دے تا کہ مقابلے کی تیاری کر لی جائے ورنہ ایکا ایکی ہونے والے ہلے کے سامنے ٹھہرنا بڑا مشکل ہوگا۔

”پتن تمہارے مونچھیں نکل رہی ہیں!“ اس نے دوبارہ مزہ لینے والے انداز سے کہا۔

لیکن پتن نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔

وہ سوچ رہی تھی اگر پتن اس بات کی محض اہمیت سمجھ سکے! وہ یہ سمجھ سکے کہ بہت سی باتیں چھپا جانے والی بھی ہوتی ہیں اور اس کے لئے اُسے اِس موضوع پر لانا ضروری تھا۔

ایک بار پھر اس نے ڈھٹائی اور بے شرمی سے کہا

”پتن تمہارے مونچھیں نکل رہی ہیں“۔

”تمہارے بھی تو —“ پتن نے ایک دم کچھ کہنا چاہا لیکن رک گیا۔ زندگی میں آج اُسے بھی پہلی بار اِس قسم کی شرم آئی تھی۔

اُس کے بعد راستے بھر مکمل سکوت رہا۔ پتہ نہیں یہ خاموشی دو روٹھے ہوئے بچوں کی سی تھی یا جنگ ختم ہوجانے کے بعد کی سی۔ البتہ اتنا چندا پر واضح ہوگیا کہ پتن اب آلگن میں گلی کھیلنے والا بلما نہیں رہا۔ اس پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ بات آگے نہیں بڑھنے کی۔

پر پتن جس چندا کو اب تک جانتا تھا وہ آج اُسے بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے برش کی ایک ہی جنبش سے کسی چترکار نے چتر کا کچھ سے کچھ بنا دیا ہو۔ پہلے وہاں چند بے ترتیب لکیروں اور نئے پتوں کے رنگ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب بھولا کے لڑکے کے بھاؤنا سے بھرے ہاتھ نے اسے سنسکرت کر دیا تھا۔

آج پتن کو پہلی بار اس جیت کا نشہ ہو رہا تھا کہ اُس کے وہ جذبات بھی اب چندا تک اپنی رسائی رکھتے ہیں جنہیں پہلے کبھی ظاہر کرتے ہوئے وہ چندا کے غصے ہی کو سوچ کر رک جاتا تھا — یہ جذبات اُس میں خود بخود کچھ عرصہ سے پیدا ہونے لگے تھے۔

اُس رات کھانے کے بعد وہ دونوں پھر ملے لیکن اور لڑکوں اور لڑکیوں کی نظریں بچا کے — حالانکہ اس کی ضرورت قطعاً نہ تھی۔ چندا کو امید تھی پتن کھل کر بات کرے گا۔ لیکن پتن سہموں کے مارے مرا جا رہا تھا۔

"تم نے کھانا کھا لیا؟"

"ہاں"

"نیند تو نہیں آ رہی؟"

"نہیں"

"کل آٹا لینے چلو گی؟"

چندا دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"سلطان کے گھر میں چوہیا بولی چائیں چوئیں 'چس' دور

کوئی لڑکا کھڑا آنکھ مچولی کے لئے چور کا انتخاب کر رہا تھا۔
پتن کو جیسے اس خاموشی کو توڑنے کے لئے موضوع ہاتھ آ گیا۔ بولا
"آؤ نا ہم بھی کھیلیں"۔ لیکن اُس کا انداز ایسا تھا جس سے یہ
آس ٹپکتی تھی کاش چندا ہاں نہ کہے۔

چندا نے منہ پھیرے پھیرے تعجب سے کہا "کیا؟"

"کوئی کھیل"۔

چندا نے سر پھیر کے بڑی حیرت سے اپنے گوبر گنیش پریمی کو دیکھا اور مسکراتی ہوئی بولی "اچھا آؤ"۔

پتن نے ڈھونڈھ کر ایک سینک اٹھائی اور اُسے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر بولا "کھینچو"۔

چندا پورے کھیل کو جلد ختم کر دینا چاہتی تھی بولی
"ایسے نہیں اکڑ بکڑ کرلو"

پتن پہلے تو ہنکلایا پھر اُس نے چندا کے اور اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کے گنتی گننی شروع کردی۔ اس عرصہ میں دوسری طرف جو کھیل ہو رہا تھا وہ کئی بار اپنے اختتام کو پہنچا اور دوبارہ شروع ہوا لیکن پتن اور چندا دیر تک ایک دوسرے کو بے ایمان ٹھہراتے گئے اور کتنی ہی بار پتن نے اپنے اور چندا کے سینے پر ہاتھ مار مار کے اکڑ بکڑ کی۔ یہ ایک طرح کا نیا کھیل تھا جو دونوں نے مل کر آج دریافت کیا تھا۔

پھر چندا ناراض ہوکر زمین پر بیٹھ گئی۔ پتن بھی ڈرتے ڈرتے اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر چندا شکایت کرے گی تو وہ بھی کرے گا۔ پھر اُس نے سوچا لیکن اب چندا شکایت کر بھی کیسے سکتی ہے۔

اس تمام سکوت کے دوران میں کئی ماؤں نے آدھی رات گزر جانے پر اپنے بچوں کو واپس گھروں میں بلایا۔ کئی لڑکے آپس میں لڑے اور کتنے لگاتار اِس چپکی کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔

تب چندا نے حیران کر دینے والے لہجے میں یکلخت کہا

"پتن میں اب سے تمہارے گھر نہیں آئے کی"۔

"کیوں؟"

"تمہاری ماں باتیں بہت بناتی ہیں"۔

اگر یہ الفاظ پہلے کبھی چندا کے منہ سے نکلے ہوتے تو وہ فوراً اپنی ماں سے جا کر کہتا اور چندا کو ڈانٹ کھلواتا لیکن آج تو پوری دنیا نے نہ جانے کیسے ایک نئی ڈگر پکڑ لی تھی اور وہ خود بھی اُسی پر چل رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے دل سے اُس نے کہا

"تمہیں کیا کہتی ہیں وہ؟"

"مجھے نہیں کہتیں، اوروں سے کہتی ہیں"۔

"کیا؟"

"یہی کہ چندا اتنی بڑی ہوگئی ہے اب تک لونڈوں کے سنگ کھیلتی ہے"۔

"کس سے کہا تھا؟"

"سب سے۔ سارے محلے سے"۔

پتن تعجب میں ڈوب کر رہ گیا۔ چندا کو جوان سمجھنے میں صرف ایک اُسی نے دیر لگائی تھی اور خود اُس کی ماں اُس سے بازی لے گئی تھی۔

"تو کل چکی نہیں چلو گی؟"

کوئی لڑکا کھڑا آنکھ مچولی کے لئے چور کا انتخاب کر رہا تھا۔ پتن کو جیسے اس خاموشی کو توڑنے کے لئے موضوع ہاتھ آ گیا۔ بولا ''آؤ نا ہم بھی کھیلیں''۔ لیکن اُس کا انداز ایسا تھا جس سے یہ آس ٹپکتی تھی کاش چندا ہاں نہ کہے۔

چندا نے منہ پھیرے پھیرے تعجب سے کہا ''کیا؟''

''کوئی کھیل''۔

چندا نے سر پھیر کے بڑی حیرت سے اپنے گوبر گنیش پریمی کو دیکھا اور مسکراتی ہوئی بولی ''اچھا آؤ''۔

پتن نے ڈھونڈ کر ایک سینک اٹھائی اور اُسے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر بولا ''کھینچو''۔

چندا پورے کھیل کو جلد ختم کر دینا چاہتی تھی بولی

''ایسے نہیں اکڑ بکڑ کرلو''

پتن پہلے تو ہنکلایا پھر اُس نے چندا کے اور اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کے گنتی گننی شروع کردی۔ اس عرصہ میں دوسری طرف جو کھیل ہو رہا تھا وہ کئی بار اپنے اختتام کو پہنچا اور دوبارہ شروع ہوا لیکن پتن اور چندا دیر تک ایک دوسرے کو بے ایمان ٹھہرایا کئے اور کتنی ہی بار پتن نے اپنے اور چندا کے سینے پر ہاتھ مار مار کے اکڑ بکڑ کی۔ یہ ایک طرح کا نیا کھیل تھا جو دونوں نے مل کر آج دریافت کیا تھا۔

پھر چندا ناراض ہوکر زمین پر بیٹھ گئی۔ پتن بھی ڈرتے ڈرتے اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر چندا شکایت کرے گی تو وہ بھی کرے گا۔ پھر اُس نے سوچا لیکن اب چندا شکایت کر بھی کیسے سکتی ہے۔

اِس تمام سکوت کے دوران میں کئی ماؤں نے اتنی رات گزر جانے پر اپنے بچوں کو واپس گھروں میں بلایا۔ کئی لڑکے آپس میں لڑے اور کتنے لگاتار اِس چپکی کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔

تب چندا نے حیران کر دینے والے لہجے میں یکلخت کہا

"پتن میں اب سے تمہارے گھر نہیں آئے گی"۔

"کیوں ؟"

"تمہاری ماں باتیں بہت بناتی ہیں"۔

اگر یہ الفاظ پہلے کبھی چندا کے منہ سے نکلے ہوتے تو وہ فوراً اپنی ماں سے جا کر کہتا اور چندا کو ڈانٹ کھلواتا لیکن آج تو پوری دنیا نے نہ جانے کیسے ایک نئی ڈگر پکڑ لی تھی اور وہ خود بھی اُسی پر چل رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے دل سے اُس نے کہا

"تمہیں کیا کہتی ہیں وہ؟"

"مجھے نہیں کہتیں، اوروں سے کہتی ہیں"۔

"کیا؟"

"یہی کہ چندا اتنی بڑی ہوگئی ہے اب تک لونڈوں کے سنگ کھیلتی ہے"۔

"کس سے کہا تھا؟"

"سب سے۔ سارے محلے سے"۔

پتن تعجب میں ڈوب کر رہ گیا۔ چندا کو جوان سمجھنے میں صرف ایک اُسی نے دیر لگائی تھی اور خود اُس کی ماں اُس سے بازی لے گئی تھی۔

"تو کل چکی نہیں چلو گی؟"

"نہیں"۔

"پھر آٹا کیسے آئے گا؟"

"مجھ سے مطلب! میں تو تمہیں نظر لگاتی ہوں نا"۔ پھر چندا ایک دم چونک کر بولی "اب میں سمجھی انہیں میرا بڑا ہونا کیوں برا لگا"

"کیوں؟" پتن نے بدھو پنے سے پوچھا

"اُن کا سارا غصہ اِس بات پر ہے، مجھے اُس دن ان کا لٹی لاف پڑھنا برا کیوں لگا۔ میں بسکٹ جو اُن کے منہ پہ مار کے چلی آئی تھی! بڑی آئیں مجھے نیچ سمجھنے والی"۔

پتن کا دماغ چھن بھر تو ماؤف رہا پھر اسے وہ چکی والا سماں یاد آ گیا۔ چندا کی کمزوری سوچ کے اس میں نئی ہمت آ گئی۔ اس نے چندا کے سر کے پیچھے سے اپنا بازو گھماکے اس کے منہہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا

"کون سمجھتا ہے تجھے نیچ!"۔

(۳)

ندی میں گرمیوں کے بعد جب پہلا پانی آتا ہے تو بڑا ٹھہر ٹھہر کے آگے بڑھتا ہے۔ لیکن ایک بار جب پوری ندی پانی سے نہا جاتی ہے تو پھر یہ کہنا کہ کل پانی کہاں ہوگا بڑا مشکل ہے۔ پانچ، دس، پچیس — لمحوں میں سطح کہیں سے کہیں جا پہنچی اور بیساکھ میں چوپائیوں، پنچھیوں اور آدمیوں نے جو نقوش بڑی خاموشی سے ریتے پر بنائے تھے پلوں میں برسات کے گدلے اور شور مچاتے ہوئے پانی کے بے رحم پھیلاؤ کے نیچے دب کر رہ گئے۔

کئی بار چندا نے چاہا اُن میں سے کسی ایک کا سہارا لے لے لیکن جس چیز کو وہ رسی سمجھ کر پکڑنا چاہتی تھی وہ ڈبونے والی لہر نکال جاتی تھی۔

پتن اب پڑھائی کا متوالا ہو رہا تھا۔

تھوڑے ہی دن بعد چندا کا گھر سے نکلنا بند ہو گیا۔ سارے محلے میں یہ خبر پھیلی ہوئی تھی کہ چندا پیٹ سے ہے۔ ایسے میں اُس سے ملنے جانا بڑے جوکھم کا کام تھا۔ لوگ بھی عجیب عجیب تھے: جو چندا سے مل چکے تھے وہ بات سن کر سنی ان سنی کر جاتے تھے، جو نہ ملے تھے دکانوں پر بیٹھ کر اُس سے اپنی جان پہچان کا بکھان کرتے تھے۔

دھیرے دھیرے جب چندا پتن کے ذہن میں کبھی پڑھائی کے دوران میں اُبھرتی تو اُسے بھولا کا لڑکا اپنے تھوک سے سان رہا ہوتا۔ پھر وہ خود پتن سے ڈھیٹ بن کر کہتی ''پتن تمہارے مونچھیں نکل رہی ہیں'' اور یہ کہ ''ایسے نہیں اکڑ پکڑ کر لو''۔ اُس کا جسم گدرا جاتا اور وہ اپنی چندھی ماں کی نظریں بچا کر اپنا بچہ پنالے میں گرا آتی۔

پتن کو اِس پورے ناٹک میں سوائے تلذذ کے کچھ نہ نظر آتا۔ اُسے ایسا لگتا تھا جیسے بچہ گراتے میں بھی چندا ٹھل ٹھل ہنس رہی ہوگی۔

یہی کچھ چندا سوچتی تھی۔ وہ جانتی تھی پتن کو کبھی پڑھائی سے سوچنے کی مہلت نہ ملی ہوگی۔ تب پتن کی یاد اس کے سامنے وہ رات لے آتی جب حالات کی دھارا نے اُسے ایک ہی غوطے میں محلے والوں کے لئے سیتا سے سروپ نکھا بنا دیا تھا۔

ایک دن حاجی جی کے سب سے چھوٹے لڑکے نے ہوت کی اچکن پہنی تھی اور اس نے اُنہیں دیکھتے ہی کہا تھا
"چنو بھیا تو آج نوشہ لگ رہے ہیں"۔

اس پر حاجی جی نے ایک دم غصے سے کہا تھا "تیری ایڑی مین گو"۔
"وہ سب کے سامنے تچھ بنا کے رکھ دی گئی تھی اور اس نے سوچا تھا وہ اب ان لوگوں سے کبھی نہ ملے گی۔ یہ اور ایسی ہی آن گنت اور باتیں — باوجود اِن سب کے اُسے وہ لوگ دوبارہ اچھے لگنے لگتے۔ خورشیدہ مزے سے دھوپ میں پرانے تختوں کی چوکی پر بیٹھی اڑد کی کھچڑی کھاتی ہوگی۔ فیض آباد والے ماموں اپنی رکھیلی فیض آباد ہی میں چھوڑ کر ان جانے اس بیچ میں کتنی بار آئے ہوں گے!

مگر یہ امن اور سکون کی دنیا اُسے اپنے سے دور پھینک کر زیادہ دیر چین سے نہ رہ پاتی — کلاونتی بار بار تلک کامود سے بھٹک کر خود بخود راگ دیس پر جا پہنچتی۔

اُسے وہ دن یاد آتا جب اُس نے کتنی تکلیف اور کتنے درد سے اپنی جھولی سے اُس بھیک کو نکال پھینکا تھا جسے سب چوری کا مال بتا رہے تھے اور جس کا دینے والا اتنا بھلا مانس تھا کہ مشہوری سے بچنے کے لئے وہ خود دان دے کر مکر گیا تھا اور وہ پوری خون میں نہا گئی تھی۔

لیکن جب اُسے ہوش آیا تو اُسے پتہ چلا اس کی ماں نے اس کا بیاہ بیر پور کے ایک بوڑھے جلاہے سے کر دیا ہے۔
چلتے وقت نہ برادری والے آئے، نہ محلے کے لوگ اور نہ ہی وہ معصوم سانوریا پتی۔

(۴)

اِن واقعات کو برس بیت گئے۔
چندا اَدھیڑ ہو چکی تھی اور اُس الیولی اسکول ماسٹر کی طرح جو شور بڑھ جانے پر چونکتا ہے، بے جانے بوجھے ایک بچے کو سزا دیتا ہے اور پھر سو جاتا ہے، شہر والے بھی اُسے دیش نکالا دے کر تقریباً بھول چکے تھے۔ وہ خود بھی اس بے جا سزا کو اُس بے خطا بچے کی طرح چپ چاپ پی گئی تھی۔

ماں اپنے کپوت کو گھر سے نہیں نکالتی، جو نکالتی بھی ہے تو من ہی من میں کڑھا کرتی ہے۔

پر دنیا جو اتنی ماؤں کی ماممتاؤں سے مل کر بنی ہے عجیب بات ہے محبت کے معاملے میں سدا ننگی بھوکی رہتی ہے — اُس کے پاس دان دینے کو اگر کچھ ہے تو صرف استہزا اور ملامت۔

انہی دنوں کا ایک واقعہ ہے محلے میں جو بھنگن کمانے آتی تھی مر گئی۔ اُس کے پرکھوں سے جو گھرانے چلے آتے تھے اِتنے زیادہ تھے کہ اُنھیں کمانا کسی ایک انسان کے بس کا کام نہ تھا۔ اچھے دنوں میں ساس، سسر، نند، جٹھانی سب مل کر ٹھکانوں پر جاتے تھے تب کام پورا ہوتا تھا۔ اب وہ سب مر کھپ گئے تھے۔ بھنگن کے مرنے کے بعد اُس کے دونوں لڑکوں کے علاوہ اس کی جوان بیٹی کو بھی مجبوری درجے کام پر آنا پڑا۔ گونا ہوئی ہوئی لڑکیاں عموماً گھر کا کام کرتی ہیں۔ پر اِس شرم کے لئے لگے لگائے گھرانے کون چھوڑتا۔

جیٹھ ہی کا مہینہ تھا، لو چل رہی تھی۔ چوک اور گلیاں سنسان پڑے تھے۔ تیسرے پہر حاجی جی جب اپنی لکڑیوں کی

نال کی طرف جانے کے لئے کندھے پر تولیہ ڈالے باہر نکلے تو نائب صاحب کی ڈیوڑھی میں جہاں ایک زمانے میں اُن کا تانگہ کھڑا کیا جاتا تھا انہیں نئی بھنگن نائب صاحب کے نوکر کے ساتھ نظر آئی۔ ڈیوڑھی میں پڑے کاٹھ کباڑ میں سے کچھ باہر دکھائی دے جانا کافی مشکل بات تھی۔ مگر وہ اوٹ جسے اُن دونوں نے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کیا تھا اُس نے حاجی جی کے گمان کو یقین سے بدل دیا۔

"پتہ نہیں دونوں چھپ کر کیا کر رہے تھے" حاجی جی بار بار یہی کہے جاتے تھے۔ کیوں کہ جب وہ گھر کے سامنے سے گذرے تو انہوں نے دیکھا اندر کھڑی ہوئی لڑکی کا منہ بالکل اُس نوکر کے منہ سے ملا ہوا تھا۔ اُن کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ فوراً نیچے بیٹھ کر جھاڑو دینے لگی تھی اور وہ لڑکا گھر کے اندر چلا گیا تھا۔

ایسی بات اِس محلے میں کبھی پہلے نہ ہوئی تھی یا اگر ہوئی ہوگی تو لوگوں کو بسر گئی تھی۔ چندا کی بات مختلف تھی اُسے کسی نے دیکھا نہ تھا — اور یوں بھی وہ لوگوں کو کہاں یاد رکھی تھی — یہاں تو چور چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ جس لڑکی کا چال چلن اچھا نہ تھا اور جو نوکروں سے یارانہ گانٹھتی پھرتی تھی ایسی لڑکی اگر سب کے گھروں میں آتی جاتی رہی تو لڑکوں کا بگڑ جانا لازمی تھا۔

حاجی جی کے شور مچانے پر سارے محلے والے آن جمع ہوئے۔ سب کے درمیان میں وہ گھبرائی ہوئی لڑکی سوچنے سمجھنے کی قوت کھو کر زمین پر بیٹھی جھاڑو کے تنکوں کو انگلیوں سے مسل رہی تھی۔

کافی دیر بعد جب بھیڑ چھٹی اور اُسے دوبارہ شام کی کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا تو اسے پتہ چلا آئندہ سے اُس کا اس محلے میں داخلہ بند ہے۔

اب وہ جہاں جاتی لڑکے اُسے گھورتے اور لوگ اُس کے بارے میں کانا پھوسیاں کرتے کہوں کہ اِس واقعہ نے اُسے ایسا ہی بنا دیا تھا۔ جوار بھاٹے کے وقت جو لہریں دور تک خشکی پر چڑھی چلی آتی ہیں جب واپس جاتی ہیں تو کتنا ہی پانی چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ دور ساگر کا بپھرا ہوا جل اپنے سناتن ناچ میں کبھی یہ دیکھنے کو نہیں ٹھہرتا کہ وہ جو اُس میں سے تھا خود اُس کی کسی اُجڈ واسنا کے کارن اُس سے بچھڑ چکا ہے!

پتن کو چندا کبھی بھولے بھٹکے ہی یاد آتی تھی۔ اجو بالکل بوڑھی ہوگئی تھی اور پتن کی بڑی بیٹی آمنہ پردے میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ اب سیانی ہوگئی ہے، کلام مجید ختم کر چکی ہے، تھوڑے دنوں میں بیاہ کر اپنی سسرال چلی جائے گی — جوان بیٹی کی موجودگی میں اپنا معاشقہ سوچتے ہوئے بھی باپ کو لاج آتی ہے۔ چندا کو اپنا سمجھنے میں اُس کی شرم اس افسر کی سی تھی جو اپنے رشتہ دار ماتحت کو اپنا ناتی سنتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ چندا کی شرم ایسی نہ تھی۔ اُسے اگر دکھ ہوتا بھی تھا تو اِس بات کا کہ اُس نے کس مورکھ سے پریت لگائی تھی جو محبت کر کے اس کی کبھی خبر لینے کو بھی نہ پلٹا تھا۔ مانو شہر کی عورتیں اتنی دور اُسے پیدل ملنے نہ آ سکتی تھیں پر وہ خود تو مرد تھا، اُس کے پیروں میں ایسی کونسی مہندی لگی تھی جس کے رچنے کا

وہ اتنے برسوں سے انتظار کر رہا تھا؟
چندا کا بجھا ہوا احساس، غم صرف دوسروں کی بے اعتنائی یاد آنے پر بھڑک اُٹھتا تھا۔

بھادوں کا مہینہ تھا جب صوبجات کی ندیاں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں اور آکاش پر بادل ہر وقت اِس طرح منڈلایا کرتے ہیں جیسے لڑکیوں کے اسکولوں کے آس پاس آوارہ سر پھرے لڑکے۔

چندا اپنی جھونپڑی میں پیروں پر چادر ڈالے کھاٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ رات بھر اور دن بھر کی اٹکٹ بارش سے پورا گاؤں ڈہا گیا تھا۔ ہوا کے جھونکوں نے بانس کی کھپچیاں توڑ ڈالی تھیں اور رات میں جب جب بجلی چمکتی تھی چندا بخار کی بےہوشی سے چونک پڑتی تھی۔ دور کے کئی گاؤں بھیا کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ گاؤں والے گھبرائے ہوئے تھے لیکن چندا کے لئے یہ ساری باتیں سپنے کے کسی بھیانک سین سے زیادہ نہ تھیں جسے دیکھ کر آدمی جاگنے پر ہمیشہ مسکراتا ہے۔

وہ پتہ نہیں کیا کیا باتیں سوچ رہی تھی۔ پاس کے دکھ کیا ہیں اسے وہ بھولی ہوئی تھی۔ دور کے دکھوں پر وہ اس طرح غصے میں آ جاتی تھی جیسے ابھی ہو گذری ہو۔

جس وقت پتن پانی میں چوڑا جھونپڑی میں داخل ہوا اُس وقت بارش رُکی ہوئی تھی، بادل پھٹ چکے تھے۔ سہ پہر کی دھوپ ہر طرف کسی بالک کی مسکراہٹ کی طرح بکھری ہوئی تھی اور باہر سے آتی ہوئی برسات کی نم ہوا میں، وہ لیٹی ہوئی اپنے دونوں ہاتھ جوڑے، انگلیوں کے دائرے بنا بنا کر کبھی سکون سے اور کبھی دالت ہِس ہِس کر گا رہی تھی:

مایا کے لونڈے، باپ نے بڈھے کو بیاہی رے
لونڈے حرامی ہنس پڑے بڈھے کی جورو رے

گاتے گاتے وہ بیچ میں رک بھی جاتی تھی جیسے سانس پھول رہا ہو یا دماغ بھٹک کر کہیں اور پہنچ جاتا ہو۔

پتن نے حیرت سے اسے دیکھا اور آگے بڑھتا ہوا بولا

"یہ گیت تمہیں اب تک یاد ہیں؟"

چندا سمجھ گئی کون آیا ہے۔ اپنی خوشی دبا کر اُس کی طرف بغیر سر موڑے بولی

"اب تک کا کیا مطلب؟ یہاں لڑکیاں تو ہیں نہیں جو میری ماں کو کوسیں، میں خود ہی کوس رہی ہوں۔ رات جو میں نے بڈھے کو دیکھا تو پتہ چلا اُس کے منہ میں نہ دانت ہے نہ پیٹ میں آنت، اور چلا ہے مجھے اپنی لُگائی بنانے! دروازہ بند کر دو پتن مجھے ہوا لگ رہی ہے"۔

"پر تم بھی تو اب ـــــ" پتن نے کچھ کہنا چاہا پھر چندا کو دوبارہ گاتے دیکھ کر خود ہی سے ٹھہر گیا

پیلا دوپٹہ اوڑھ کے کوٹھے پہ جب چڑھی
لونڈے حرامی ہنس پڑے بڈھے کی جورو رے

دیر تک چندا براتی رہی، پھر اپنی ماں کو گالیاں دینے لگی۔

پتن نے اچنبھے سے اُس کی باتیں سنیں اور کچھ دیر بعد بولا

"خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا، مگر اب تمہیں اتنے سال گذرنے کے بعد بڑھاپے میں ماں کی یاد کیوں آ رہی ہے؟"

چندا نے اُسی لہجے میں جواب دیا "اور تمہیں اتنے سال گذرنے کے

بعد چندا کی یاد کیسے آ گئی؟"

پتن ابھی تک اتنا ہی بدھو تھا، 'چندا کی یاد'، پر اُس نے اِدھر اُدھر گھبرا کے دیکھا کہ کہیں کوئی اور کھڑا سن تو نہیں رہا، پھر بولا

"وہ تمہارا گھر ہے نا! اُسے تمہارے رشتے دار بیچنا چاہتے ہیں، میں اِس لئے آیا ہوں کہ پڑوسی —"

"چھوڑو پتن اِن باتوں کو" چندا نے اُس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا "بہو اچھی ہیں؟"

"ہوں"

"تمہاری بیوی؟"

"ٹھیک ہے"

"بچے؟"

"وہ بھی"

"کتنے ہیں اب؟"

"دو لڑکیاں دو لڑکے"

"سب کو کھانا تو ٹھیک سے ہضم ہو جاتا ہے نا؟"

"چھوڑو چندا ان باتوں کو۔ شہر آؤ نا کبھی" پتن نے دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بات کو اُدھر میں لٹکانے کی خاطر کہا۔

"شہر آؤں!" چندا نے بڑی کڑوی ہنسی سے کہا۔ "اور جو تمہاری بیگم صاحب کو شک پڑ گیا تو؟ چھوٹے صاحب گھر سے اِس عمر میں نکلنا بند ہو جائے گا۔ عورت کو تم ابھی تک نہیں جانتے! وہ بچپن سے بڑھاپے تک مرد کو سنبھال کے رکھنا جانتی ہے۔ نہ رکھ پائے یہ علیحدہ بات ہے"۔

پھر وہ ہنستی ہوئی بولی "عجیب قانون ہیں مذہب والوں کے۔ میرے پسوائے ہوئے آٹے سے کسی کو نظر نہیں لگتی تھی۔ اُس سے بنی ہوئی روٹی پر اگر میری نظر پڑ جاتی تھی تو سب اوکنے لگتے تھے"۔

پتن کچھ دیر گم متھولا بنا رہا جیسے کسی اگلی بات کے لئے الفاظ اپنے ذہن میں ترتیب دے رہا ہو۔ پھر پھولی ہوئی سانس سے بولا

"ایک بات بتاؤ گی چندا؟"

"پوچھو"

"وہ بچہ کس کا تھا؟"

"کون سا؟" چندا نے اپنی بچپن والی معصومیت سے پوچھا۔ شاید اُس نے ابھی تک حالات کے اِس طنز کو محسوس نہیں کیا تھا جو ایسے سمے میں پتن کو مکان کا بٹوارہ کرانے کے لئے یہاں لایا تھا اور جواِس وقت جب وہ بخار سے بُھن رہی تھی اُس سے یہ بیہودہ سوال کروا رہا تھا۔

"کونسا کیا مطلب؟ تمہارے اور بچے بھی ہو چکے ہیں؟" پتن نے بھولچکا ہو کے پوچھا

"تمہیں نہیں معلوم میری امرن کا؟" چندا نے اِس استعجاب سے پوچھا جیسے اُس کی لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر ساری دنیا میں پھیل چکی تھی اور پتن وہ اکیلا پڑھا لکھا اَن پڑھ تھا جسے اب تک یہ خبر نہیں معلوم تھی۔

"نہیں تو" پتن نے کٹھور بنتے ہوئے جواب دیا

"اور میں ہو شہر سے آنے والے سے یونہی تم سب کا پوچھ پوچھ

کے بلا ناحق میں ہلکان ہوتی رہی ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں مجھے پتہ چلا تھا خورشیدہ کو اسقاط ہوگیا تھا۔ رتی رتی بات کی میں خبر رکھتی ہوں اور تمہیں میری ایک بیٹی ہے، اس کی بھی خبر نہیں!''

''کتنی بڑی ہوگئی ہے؟'' پتن نے کچھ دیر چپ رہ کے پوچھا حالانکہ اُسے اپنی آمنہ کی عمر اچھی طرح یاد تھی۔

''کتنی بڑی؟'' چندا چادر پھینک کر کھاٹ پر اُٹھ بیٹھی۔ ''وہ بڈھا حرامی کب کا مرگیا جس سے میری ماں نے میری تقدیر پھوڑی تھی اور میری امیرن کو جسے میں نے پال پوس کر بڑا کیا تھا زمیندار کا لونڈا زبردستی بھگا لے گیا۔ صبح کھیت پر گئی تھی۔ اُسے لے جائے ہیضہ — پتہ نہیں کب سے تاک میں تھا۔ اری میں لے تو اس کی بات کرن پور میں پکی کی تھی۔ ایسی تھی میری امیرن اِن گنواروں کی لڑکی کیا ہوگی!''

اس کا غصہ آنسوؤں میں پھوٹ پڑا۔ دیر تک وہ بلک بلک کر روتی رہی۔ پتن سر جھکائے ندردی بنا زمین کی طرف دیکھتا رہا۔

آہستہ آہستہ چندا کا رونا تھمنے لگا۔ تب اُسے ایسی ہی ایک سہ پہر کی یاد آئی جب وہ خود امیرن جتنی تھی۔ پتن دودھ میں بسکٹ چور رہا تھا اور دھوپ سے بھرے دالان میں اجو اپنے بیٹے سے لٹی لاف پڑھنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ یہاں گاؤں میں آکر وہ نفرت بھولی بسری ہوگئی تھی، آج اُسے ایک دم کسی نے کرید ڈالا۔

اُس وقت اُس کا کلیجہ اپنی بیٹی کے ہجر میں غم سے پھٹنے لگا۔ اُس نے جولاہیوں کی طرح اپنے بال کھول ڈالے اور سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی

"پتن میری امیرن کو زمیندار کے بیٹے کی نظر لگ گئی۔ تمہاری ماں تو کہتی تھیں 'نیچ بھوکے ہوتے ہیں اُن کی نظر بڑی ظالم ہوتی ہے'— پر میں نے تو یہی دیکھا تم اونچوں کی نظر نے مجھے بھی اور میری امیرن کو بھی کھالیا۔ اب میں کون سے لئی لاف پڑھوں!"۔

○

بیدی
سویرا، لاہور۔ (غالباً ۵۴/۱۹۵۳ء)
۱۵-۱۶، ۲۴۸ تا ۲۵۹
(سنہ طباعت درج نہیں ہے)

ہمارے دن، ہمارا زمانہ

تو ہم کل پانچ جنے تھے، بیگر (۱) دین ارائیں کا لڑکا اختر، منٹھار حاجی (۲) کا بھائی یٰسین اور ہمارے پاڑے کے دو چھوکرے جالی اور نزار — گل شکر بائی والا نزار۔

ہم خان فرائی مرکز کے بازو کی گلی میں پروگرام کے مطابق جمع ہوئے تھے اور وہاں کھڑے رہنے سے میری ناک میں گوشت سکنے کی باس بھر گئی تھی اور سامنے سر کٹی، ننگی، اُلٹی لٹکی ہوئی مرغیوں اور بکروں کی ننگی رانوں کو مع اُن کے بیچ کی ننگی جگہوں کے تاروں سے لٹکتے دیکھ کر میرا دل کچا ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”گلی گلی چلو“۔

---

(۱) Beggar : فقیر

(۲) منٹھار حاجی

شام ہو گئی تھی اور مین روڈ پر بڑی عمر کی عورتیں تیز تیز قدم اُٹھاتی جماعت خانے کو جا رہی تھیں۔ اُنھوں نے نائیلون کی ساریوں کے پلّو خوب کس کر اپنے کندھوں پر لپیٹ رکھے تھے جیسے ڈر رہی ہوں ہوا سے اوپر کا جسم کھل نہیں جاوے۔ اُن کے آگے پیچھے لال پیلے سوٹ پہنے لڑکیاں تھیں۔ دو، دو تین، تین کی ٹولیوں میں جو کھلنڈرے انداز سے چل رہی تھیں جیسے نماز پڑھنے کو نہیں جا رہی ہوں کسی کے گھر فنکشن میں جا رہی ہوں۔

یہی ٹائم ہوتا ہے کہ میری ماں بھی گھر سے ایسے ہڑبڑا کر نکلتی ہے جیسے دن بھر جیل میں بند رہی ہو۔

اب ایک تو اپنے ساتھ والوں کا میرے کو اِن عورتوں کو دیکھنا پسند نہیں ہے دوسرے یہ بھی ڈر تھا کہ اِن لڑکوں کے ساتھ میری ممی نے اگر مجھے دیکھ لیا تو اس وقت تو لحاظ میں کچھ نہیں بولے گی پن جماعت خانے سے واپس آنے پر پہلا کام وہ یہ ہی کرے گی کہ پپا سے کہوے کہ "تمے پیار علی سے پوچھو آج شام کدھر گیا تھا اور جدھر بھی گیا تھا اس کے لئے اُس کے پاس پیے سے (پیسے) کہاں سے آئے تھے؟"

میرے کو ممی کے پیسے کو پیے سے بولنے پر ہمیشہ خار آتا ہے۔ جب وہ میرے اردو بولنے والے دوستوں کے سامنے اِس طرح بات کرتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگتے ہیں اور میں سمجھ جاتا ہوں اب باہر نکل کر چھیڑ خانی کرینگے:

'ڈِکرا پیار علی۔ کیا؟— جرا چار پیے سے تو نکال۔ کیا؟—

مارتول براالڈ سگریٹ کھریدلی ہے۔ کیا؟،
آب اِس میں کچھ لفظ تو ممی کے ہیں اور کچھ پپا کے۔ پپا، اگر گنو تو ایک جملے میں دوبار تو کیا لگاتے ہیں۔ 'وہ آیا تھا۔ کیا؟ — اُس لے تیرے کو بولا تھا۔ کیا؟،

بلا فضول اور بے جگہہ، اور ہتوڑے کو مارتول کہتے ہیں۔ اور میرے دوست جس کے گھر جاتے ہیں بس اِسی فکر میں رہتے ہیں کہ اُس کے گھر والوں کی زبان پکڑیں۔

خیر اُس وقت تو میرے کو شرم دوسری ہی بات کی تھی۔

میری پتلون کی جیب میں جو ہاتھ تھا اُس میں میں نے دس روپے کا نوٹ تعویذ بنا کر دبا رکھا تھا اور مجھے معلوم تھا جب گھر آئے پر ممی اپنے چولے کا جھاڑا لیوے گی تو سارے گھر کو سر پر اٹھا لے گی کہ 'دس روپے کا نوٹ کدھر گیا، اور اُسے جیسے بار بار تعجب ہوگا کہ 'اکھا نوٹ کیسے گائب ہو سکتا ہے'۔

مطلب یہ کہ کوئی لے جاتا تو آدھا لے جاتا، پاؤ لے جاتا۔ سارے کا سارا کیسے لے گیا۔

اِن لوگوں کے روپئے کو رُو پے کہنے پر بھی میرے دوست میری ہنسی اڑاتے ہیں۔

میں یہ بھی جانتا تھا نوٹ نہ ملنے پر ممی کا پہلا شبہہ تو سمجھو میرے پر ہی جائینگا، اس لئے کہ ضرورت ہونے پر بھی میں پپا سے پیسے نہیں مانگتا۔ جب مانگتا ہوں ممی سے مانگتا ہوں اور وہ ہے کہ ہر ایک سے کہتی پھرتی ہے 'پیار علی کو تو بس پیسے چاہیئے'۔

پن اس وقت معاملہ کچھ ایسا تھا کہ میرے کو معلوم تھا آج تو یہ رات بھر کبھی علی کو یاد کرے گی، کبھی پیار علی کو — اور جیسا کہ ہمیشہ کہتی ہے کہے گی

'آج اِس بات کا کھلاصہ ہونا چاہیئے کہ گھر سے جو چیزیں غائب ہوتی رہتی ہیں کدھر جاتی ہیں اور اِتنا پیسا کدھر جاتا ہے'۔

پھر مجھے معلوم تھا پپا اسکو چپ کرانے کی کوشش کرینگے اور پورا گھر دس روپیے کے نوٹ کو ڈھونڈتا پھرے گا: اکھیے نوٹ کو، آدھے پونے کو نہیں۔ سونے کے کمروں میں، غسلخانے میں، سنڈاس میں اور جب میں بھی مکر جاؤنگا کہ 'میں نے نہیں دیکھا کوئی نوٹ ووٹ'، تو ممی چیخ چیخ کر کہے گی

'اِن سندھی، مہاجر، پنجابی لڑکوں کی سنگت میں وہ کے پیار علی بگڑ گیا ہے — اِس کا بڑا بھائی بھی ایسا ہی تھا'۔

یہ آخری بات سمجھو ایسے ہے جیسے لمبی بارش کے بعد کہیں بجلی زور سے گرے اور ہر طرف خاموشی چھا جاوے۔

میرے بڑے بھائی کو کسی کمیونٹی باہر کی چھوکری سے چھپ کر سول میرج کر لینے پر لڑکی کے گھر والوں نے غنڈوں سے اِتنا پٹوایا تھا کہ جب وہ پناہ لینے کو بازو کی مسجد میں گھسنے لگا تو غنڈوں کے ڈر کے مارے مسجد والوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور وہ وہیں سیڑھیوں پر گر پڑا۔ اور یہ سب کچھ ہوا بھی دن میں تھا۔

پھر مارنے والوں نے اُسے گھسیٹ کر اُس چھوٹے سے سنڈاس میں گھسیڑنے کی کوشش کی تھی جو ہر مسجد کے دروازے کے پاس بنا ہوتا ہے، جس میں نماز کے لئے آنے والے اکڑوں بیٹھے پیشاب

کرتے باہر سے نظر آتے ہیں اور ان کے سر دیوار سے اوپر اُٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

خیر اتنی سی جگہہ میں میرے بڑے بھائی کو تو وہ غنڈے کیا گھسا پاتے بس پیشاب کرنے کی جگہہ میں اُس کا منھہ دے دیا تھا اور نیچے کا دھڑ باہر سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔

ہسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے سنا ہے پپا سے کہا تھا "اتنی چوٹیں تھیں کہ اگر روشن علی بچ جاتا تو صرف سر ہر ۴۲ ٹانکے آتے"

یہ سوچ کر ممی کی گھگھی بندھ جاتی ہے اور وہ کہتی ہے "اُس وقت پتہ نہیں کس کی بادشاہی تھی لیکن پاکستان کو بنے جاستی ٹائم نہیں ہوا تھا اور اب —"

یہی حشر میرا ہونے والا تھا کیوں کہ اُس کی نظروں میں بیگردین کا لڑکا اختر، گل شکر بائی کا نزار اور منٹھار حاجی کا بھائی یاسین اور سیدوں کا لڑکا جانی سب کے سب آوارہ ہیں۔ پورے لوفر۔ اور اُن کی سنگت میں، میں بھی لوفر ہوتا جا رہا ہوں۔

اِس غصے میں وہ ہمیشہ ہفتہ ہفتہ، دس دس دن کے لئے جماعت خانہ جانا بھی چھوڑ دیتی ہے اور کھانا کبھی کوئی بناتا ہے کبھی کوئی، یا مجھے ہوٹل سے لانا پڑتا ہے اور پپا ہی کر رات کو دیر سے گھر لوٹنے لگتے ہیں۔

لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اِس سے پہلے میں نے ممی کے روپے کبھی چوری نہیں کئے تھے۔ جو خرچی ملتی ہے اسی میں کام چلاتا ہوں۔ پیسے چوری کرنے کا الزام البتہ میرے اوپر بہت دفعہ لگا ہے۔ بے وجہہ۔ اسی لئے نا کہ روز کی خرچی سے اوپر

کبھی کبھی میں اُن سے مانگ لیتا ہوں۔ تو اس میں سو باتیں اٹھتی ہیں 'کیوں؟ کس لئے؟ کہاں جانا ہے؟'

اب بھلا بتاؤ میرے کو غصہ آئے یا نہیں؟ جب پڑھائی میں پہلے دس لڑکوں میں میرا نمبر ہوتا ہے اور جب ہمارے اسکول میں ہال تھا اور اس کی جگہہ شاپنگ سینٹر نہیں بنا تھا تو میں نے ڈیبیٹ میں بھی انعام لئے ہیں۔

اب کیا شاپنگ سینٹر کی چھت پر ڈیبیٹیں ہوتی ہیں یا بیڈمنٹن جس میں، میں حصہ لوں؟ بس پڑھائی ہے یا ہمارا آرکیسٹرا — کھوجہ میوزک بینڈ — جسمیں میں ڈرم بجاتا ہوں۔ اور ممی اس کے بھی خلاف ہے۔

محلے کے لڑکوں سے تو وہ مجھے اور میرے بھائیوں کو بات بھی نہیں کرنے دیتی کیوں کہ وہ چاہے آٹھ سال کے ہوں یا سولہ کے ایک دوسرے سے 'تیری ماں کو' 'تیری بہن کو' کہہ کر بات کرتے ہیں اور نالی کے پاس بیٹھ کر جوا کھیلتے ہیں۔

لیکن ماں کو اچھے بُرے کی تو پہچان ہے نہیں اگر وہ مجھے ابھی ٹاٹ کی دیواروں والے گھر کے کسی ایسے لڑکے سے بھی بات کرتے دیکھ لیتی ہے جو چاہے امتحان میں اچھے نمبر اٹھاتا ہو اور جو خود اپنے گھر والوں کی بات چیت کے اسٹائل کو پسند نہیں کرتا ہووے تو بھی بومڑیاں مارتی ہے کہ 'اب پیار علی بھی گالیاں سیکھے گا'۔

لیکن اُس دن تو بات ہی ایسی آگئی تھی کہ مجھے روپئے بغیر پوچھے نکالنے پڑ گئے۔ میں اسے چوری نہیں سمجھتا کیوں کہ میری نیت خراب نہیں تھی۔ اور اگر چوری تھی بھی تو تھوڑے

دن کی — میں نے من میں وِچار کر لیا تھا کہ جب ہمار آرکسٹرا کسی فنکشن میں پیمنٹ پر بلایا جائے گا تو مجھے جو پیسے ملینگے اُن میں سے دس میں واپس ممی کے پیسوں میں ملا دونگا۔ اس لئے یہ چوری نہیں تھی۔ بس دس روپئوں کی مجھے سخت ضرورت پڑ گئی تھی اور وہ بھی اچانک۔

سن تو میں بہت پہلے سے رہا تھا جیسے پرائیوٹ فلمیں چلتی ہیں، وی۔ سی۔ آر۔ ہوتا ہے اسی طرح کی ایک چیز بی۔ پی۔ بھی ہوتی ہے جو میرے کو خبر تھی سنیما ہالوں میں نہیں چلائی جاتی ہے۔ اور اگر چلائی جاتی بھی ہے تو اُدھر کے سنیماؤں میں جدھر موالی رہتے ہیں یا جس طرف مل ایریا ہے اور بھنس پاڑا۔

اُدھر بھلا کون جاتا بی۔ پی دیکھنے۔

میں نے بی۔ پی۔ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میرے اکثر ساتھی البتہ دیکھ چکے تھے۔ ہر طرح کے لڑکے — جو پڑھائی میں فیل جاتے ہیں اور وہ بھی جو کلاس میں فرسٹ سیکنڈ پوزیشن لاتے ہیں۔ بلکہ اُن میں کچھ تو ایسے بھی ہیں جو شام کے مدرسے میں ریلیجن (مذہب) پڑھنے کو جاتے ہیں۔

یہ لوگ، بی۔ پی۔ اور وی۔ سی۔ آر۔ کے پرائیوٹ شو آٹھویں جماعت سے دیکھ رہے ہیں، بلکہ کچھ تو اُس سے بھی پہلے سے۔

ایک دن میں نے بے وقوفی میں اختر سے پوچھا تھا

"بی۔ پی۔ کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

اس نے کہا "بلو پرنٹ"

میں نے پوچھا "بلو فلم؟"

اس نے کہا "ہاں بلو فلم ہی سمجھ لے تو"

"یعنی کہ پوری کی پوری فلم بلو ہوتی ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

وہ ہنسنے لگا اور بولا "اپنے دانت دکھا"

میں نے کہا "کیوں؟"

"گنونگا" اس نے کہا "کہ کتنے ہیں"۔

اور جب اس نے زوری سے میرا منھ دونوں ہاتھوں سے اسے کھولنا چاہا جیسے بکرے کا منھ خریدتے وقت چیر کو دیکھتے ہیں تو میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا

"چل بے ہٹ، نہیں دکھاتا، فقیر دین کی اولاد Beggar!"

وہ بولا "میرا کہنا ہے تیری ممی تیرے منھ میں ابھی تک ــــ"

اب ایک تو ہمیشہ ممی کے لہجے کی نقل اتارنا دوسرے سالے نے ایسی بات کہی تھی کہ میں لڑنے کو تیار ہوگیا۔

لیکن لڑکوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

بعد میں رفیق رانگڑ نے بتایا بلو فلم کیا ہوتی ہے اور اسے دیکھنے میں کتنا مزا آتا ہے

"جیسے سمجھو رات کو تمہاری آنکھ کھل جائے اور ــــ"

میرے کان سرخ ہوگئے اور اس کی بات کاٹنے کے لئے میں نے کہا "میں تو یہی سمجھتا تھا کہ جس طرح بعض ٹیلی ویژن اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان کا اسکرین بلو ہوتا ہے بی۔ای۔ میں بھی یا تو فلم نیلی نظر آتی ہوگی یا چلاتے ہی نیلے رنگ کی فلم ہونگے"۔

اس کے بعد رفیق رانگڑ نے مجھ سے رازداری سے کلاس میں کئی

دلیہ پوچھا ''دیکھنی ہے؟''۔
یا یہ کہ ''آج ہے''۔

ایک دن جب سر کلاس لے رہے تھے اختر نے مجھے ایک پرچہ پیچھے سے دیا۔ اُس پر لکھا تھا ''آج موقع ہے''

تو اس طرح اختر سے میری دوبارہ دوستی ہوگئی۔ لیکن شو پر جانے کو میں ٹالتا رہا۔

میرے ساتھی تو کبھی کبھی کلاس سے بھی بلو پرنٹ یا وی۔سی۔آر۔ کا شو دیکھنے کو غائب ہو جاتے ہیں اور پھر بعد میں ایک دوسرے کو اُس کی اسٹوری بتاتے ہیں اور جنھوں نے وہ فلم نہیں دیکھی ہوتی ہے مزے لے لے کر سنتے ہیں۔

بعضے بعضے تو اُن میں سے ایک دوسرے سے ایکدم فری ہوجاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں 'رات والے شو میں جو عورت مرد یا لڑکا لڑکی تھے فلاں کے بھائی بھابھی یا فادر مدر لگتے تھے'۔ پھر ایک کہتا ہے 'میرے اپنے سالے تیرے'

اور دوسرا کہتا ہے 'واہ بیٹا خود اپنی بہن پہچان میں نہیں آئی!'

ایسی باتوں پر کبھی کبھی تو کلاس میں چاقو بھی نکل آتا ہے اور ایک دن جاوید نے — جسے سب چھیڑ میں جوید کہتے ہیں — پسٹل نکال لیا تھا کیونکہ کسی نے مذاق میں کہہ دیا تھا 'بی۔پی۔ فلموں میں صرف گوری لڑکیاں چلتی ہیں جیسی جوید کی بہن ہوگی'۔

کیونکہ جوید خود گورا ہے۔

اور رات والی بلو پرنٹ میں جس لڑکی کو تھرلے کے لینک میں

بتایا تھا اُس کی شکل جاوید سے ملتی جلتی تھی۔
لیکن اُسی وقت سر ہیم کلاس میں آ گئے اور جاوید نے بجائے چھپانے کے پسٹل کو سر کے سامنے اپنے ڈیسک پر رکھ دیا۔
سر ہیم کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور بات اُن کے منھ سے نہیں نکل رہی تھی۔
پھر کچھ سوچ کر پسٹل کو اٹھا کر جاوید نے پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور بولا ’’دیکھ لونگا‘‘۔
سر نے Quiet please ایسے کہا جیسے ماسی جو ہمارے گھر میں کام کرنے آتی ہے تاریخ سے پہلے پگار مانگتے وقت ممی سے بات کرتی ہے۔
اُس دن مجھ جیسے تو کچھ لڑکے کلاس سے چپکے سے پھوٹ لئے تھے۔

ویسے نزار کو بھی ای۔ ٹی۔ کا بڑا چسکا ہے اور اُس کا بڑا بھائی کرمالی تو سمجھو بلو پرنٹ کا موالی ہے۔ اُسی نے سب سے پہلے نزار کو اپنے کسی دوست کے گھر ٹیلی ویژن پر ای۔ ٹی۔ دکھائی تھی۔
نزار کی سنگت کی بنا پر وہ ہم سے بھی فری ہے اور کہتا ہے ’’ابے جب کوئی فارین سے آتا ہے تو میں اُس سے پہلا سوال یہی کرتا ہوں ’بیٹا کچھ ہائی کراسی بھی لائے ہو یا بس ریڈیو اور ٹیپ لے کر آ گئے؟‘
ابے اِن چیزوں کا زمانہ گذر گیا۔ کلر تصویروں کا میگزین ہو تو دیکھو کتنے گراہک تمہارے آگے پیچھے پھرتے ہیں‘‘۔
باپ کے مرجانے کے بعد وہ کالج کا پہلا سال بیچ ہی میں

چھوڑ کر بینک میں لگ گیا ہے اور سارے دن تصویریں بیگ میں ڈالے پھرتا ہے۔ بلیک اینڈ وھائیٹ بھی، کلر بھی۔

یوں یہ تصویریں ایک طرح کا چالو مال ہیں جیسے لائبریری کی کتابیں ہاتھوں ہاتھوں گھومتی ہیں — کوئی نہیں جانتا ہے کہاں سے آتی ہیں اور کہاں کو جاتی ہیں۔ پن کرمالی کے پاس اُن کا پورا اسٹاک ہے اور اُنہیں وہ آرٹ کے نمولے کہتا ہے۔ کہتا ہے ''دنیا کے کسی میوزیم میں انہیں جدہر ڈالگو ساوی پبلک اُدھر کو ہی آئینگی''۔

کبھی وہ ہم پہ رَوب ڈالنے کے لئے کہتا ہے

''ایسے یہ بادشاہوں کا taste (شوق) ہے۔ پرانے زمانے میں جب کیمرے نہیں تھے تو ہر بادشاہ اپنے دربار میں آرٹسٹ رکھتا تھا اور تصویر پسند آ گئی تو سمجھو آرٹسٹ بادشاہ کا فیورٹ (آنکھ کا تارہ) ہو گیا — لکھ پتی، کروڑ پتی''۔

ظاہر ہے ہم لوگوں کو اُس کی یہ باتیں سننے میں مزہ آتا ہے اور بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے جیسے وہ بلو پرنٹ کی دنیا سے اُسی پرانی درباروں کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جب بقول اُس کے ''اگر ڈائیلاگ والی فلم نہیں تھی تو کیا ہوا، آرٹسٹوں کی طرح بادشاہ کی پسند کی کتابیں لکھنے والے اسپشل کلاس رائیٹر تو تھے جو ایک ایک بات، ایک ایک ایکشن action کھول کر لکھتے تھے اور بادشاہ سلامت رات کو اُن کہانیوں کو جوان چھوکریوں سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ اب بولو ہوا پورا بلو۔پرنٹ۔کا۔شو یا نہیں؟''

پھر وہ کہتا ہے ''دنیا میں سب کاروبار جُونا ہے۔ کوئی بات نئی نہیں ہے''۔ اور ایکدم جیسے جوش میں آ کر کہتا ہے

"اور یہ تمہاری مورتیوں میں ۔۔۔ ا مذہب رکھا ہے؟"
اس کے بعد وہ مورتیوں کے جسم کے حصے علحیدہ علیحدہ گناتا ہے جیسے اُس کی نظروں کے سامنے وہ لڑکئیں ہوں جنہیں سامنے کھڑا کرکے وہ مورتیاں بنائی گئی ہونگی۔
میرا خیال ہے کرمالی بھائی کو سب سے زیادہ پیٹ کا حصہ پسند ہے اور وہ کھڈا جسے سندھی والے چھکی" اور اردو والے ناف بولتے ہیں پن ہماری گجراتی میں شاید ڈوٹی کہتے ہیں — میرے کو گجراتی ٹھیک سے نہیں آتی ہے اور لکھنی پڑھنی تو بالکل نہیں آتی — اور جب وہ کھڈا ہٹ جاوے تو پینچوڈی، جسکی مالش یہاں کی ہر قوم کی عورتیں کرواتی ہیں بلکہ میں لے تو بہت سے مردوں کو بھی سڑک کے کنارے لیٹ کر پیٹ کو ملواتے دیکھا ہے۔
خیر کرمالی کی تو باتیں ہی نرالی ہیں — اِن تصویروں کو کبھی وہ اسٹرلنگ کرنسی کہتا ہے، کبھی سوئیٹزرلینڈ کا سکہ بتاتا ہے جو ہر ملک میں چالو ہے۔ اُس کی جو باتیں ہمیں رٹ گئی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آج کل کے پچاس پچاس کے دو نوٹوں میں اِتنا دم نہیں ہے جتنا دو تصویروں میں ہوتا ہے۔ "پن ایک شرط ہے، تصویر ہو ہائی کلاس"۔
تو سمجھو کرمالی بھائی اِن باتوں کی وجہہ سے ہم سب کا اُستاد ہے اور یہ سچ ہے اپنے بینک کے مینیجر کو نئے سال کا بلو پرنٹ کیلنڈر دے کر ہی اُس لیے اُس سے دوستی کی ہے، اور بینک کے لئے کوئی بڑی پارٹی پھانستے وقت وہ چائے سگریٹ کے علاوہ تصویروں کی رشوت بھی چلاتا ہے۔
اُس کا کہنا ہے "اِس کاروبار میں loss (گھاٹا) نہیں ہے: پرافٹ ہی پرافٹ ہے"۔

اور اگر کوئی کہے 'ایک دن پکڑے جاؤ گے'

تو وہ بے فکری سے سگریٹ کا دم لگا کر کہتا ہے ''ایسے کوئی نہیں پکڑتا وکڑتا۔ پہلے جا کر اُنہیں پکڑیں ——''

سگریٹ پینا اُس نے ابھی حال ہی میں شروع کیا ہے اور ''اُنہیں جا کر پکڑیں'' کہتے ہوئے اُس کا سگریٹ والا ہاتھ اوپر کو اُٹھ جاتا ہے جیسے کسی کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔

پتہ نہیں کیسے ممی کو کرسالی پر نہیں، نزار پر شبہہ ہو گیا ہے جو وہ گل شکر بائی سے کہتی ہے

''بھین نجار کی سنگت ٹھیک نئیں ہے۔ بڑا ماننے کا نئیں ہے پن اُس پے جرا نجر رکھو''۔

یاسین کے بھائی منٹھار حاجی نے اُس شام ہمیں بلو پرنٹ دیکھنے آنے کا بولا تھا۔ اور یاسین نے میرے کو بول دیا تھا ''پورے دو ڈھائی گھنٹے کا شو ہے اِس لئے گھر سے کوئی ٹھیک سا بہانہ کرکے نکلنا''۔

یاسین اور منٹھار حاجی کے لئے بلو پرنٹ میں مزہ تو ہمیشہ ہے پن اُن کے لئے یہ چیزیں نئی نہیں ہیں۔ براڑی (۱) میں جہاں ان کے باپ کا بنگلہ ہے کلر ٹیلی ویژن سیٹ بھی ہے، پن عورتوں کے رہنے کا گھر اُس سے دور ہے۔

بنگلے میں بیٹھ کر یاسین کا باپ اپنے ہاریوں (۲) کے فیصلے بھی کرتا ہے اور اُدھر ہی دوستوں کے ساتھ کچہری کرتا ہے۔ پہلے

---

(۱) پھراڑي: براڑی۔ گاؤں (۲) ہاری: ہل چلانے والا

جب گاؤں تک بجلی نہیں پہنچی تھی تو بنگلے کے لئے یاسین کے باپ نے الیکٹرک جنریٹر لگوا رکھا تھا اور اُس وقت بھی وہ وہاں وہی عیش کرتا تھا جو اب کرتا ہے۔

اب بجلی کے آ جانے سے دن میں ائر کنڈیشنر چلتا ہے اور رات کو ٹیلی ویژن اور وی۔ سی۔ آر۔

ایسے موقعوں پر منٹھار کو بھی معلوم ہوتا ہے اور یاسین کو بھی کہ بنگلے میں کون کون ہے۔ ہاں، جانے کی اجازت اُدھر کسی کو نہیں ہوتی ہے سوائے اُس ڈرائیور کے جو سجاول سے ایک ہاری — پوٹا نوح — کی بیوی کو کار میں لے کر آتا ہے اور صبح سویرے واپس چھوڑنے کو جاتا ہے۔

یاسین کا کہنا ہے اُس کا باپ اُس چھوکری کو جو فلمیں دکھاتا ہے وہ خود اُس نے بھی دیکھ رکھی ہیں۔ کیونکہ لڑکی کے جانے کے بعد صبح اگر باپ کہیں کام سے چلا جائے جیسے کورٹ یا ڈپٹی کمشنر سے ملنے تو بنگلہ پھر اپنا ہوتا ہے۔ بس ٹیلی ویژن کو سونے کے کمرے سے چلا کر کچہری کرانے کے کمرے میں لانا پڑتا ہے۔

فلموں کے کیسیٹ سونے کے کمرے میں اِدھر اُدھر پڑے ہوتے ہیں۔ جیسے بستر پر ٹوٹی ہوئی کوئی چوڑی، یا تکئے پر لگے ہوئے دو چار لمبے لمبے بال جنہیں ہاتھ میں لے کر اُن کی گیند سی بنا کر منٹھار حاجی اپنے گالوں پر پھیرتا ہے۔ اُس نے اُس لڑکی کو دیکھ رکھا ہے۔

جب وہ اوطاق میں آئی ہوئی ہوتی ہے تو گھر میں عورتیں اور لڑکیاں خاموش سی ہو جاتی ہیں اور یاسین کی ماں نماز پڑھ کر وقت سے پہلے سونے کو چلی جاتی ہے۔ ہاں اُس کی دادی اکیلی

بیٹھی بیڑی پیتی رہتی ہے — پتہ نہیں کس وقت تک۔
ایسے میں منٹھار حاجی اگر گوٹھ (۱) میں ہوتا ہے تو چھپ کر بنگلے کے کئی چکر لگاتا ہے۔ اور جب کام نہ بنے تو گھر آ کر عمل (۲) کھا کے سو جاتا ہے۔
عمل بھی اُسے وہی ڈرائیور لا کے دیتا ہے جو بوڑھا نوح کی زال (۳) کو سجاول سے لے کر آتا ہے۔

اب یہ پتہ نہیں منٹھار حاجی صرف اُس لڑکی کو دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے یا اُس سے مل بھی چکا ہے۔ ویسے یاسین مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا ہے لیکن میرا خیال ہے اس سے آگے کی بات اُسے بھی نہیں پتہ ہے۔

یہاں اتنا ضرور ہے بہت پہلے منٹھار کے کہنے پر ڈرائیور نے اُسے راستے میں ایک جگہہ کھڑا رہنے کو کہا تھا جیسے صبح صبح پیدل کہیں کام پر جانے کے لئے اکیلا ہو۔ اور کار جب لڑکی کو لئے واٹر کورس والی کچی سڑک پر چڑھی تو منٹھار حاجی نے اُسے ہاتھ دیا۔

لڑکی چپ بیٹھی رہی اور ڈرائیور نے اپنے برابر کی سیٹ کا دروازہ منٹھار حاجی کے لئے کھول دیا۔ اور میرا خیال ہے مین روڈ سے پہلے ہی کہیں ڈرائیور نے اُسے اتار دیا ہوگا کیونکہ اِس سے زیادہ بات کی خبر کسی کو نہیں ہے۔

یاسین میرا اچھا دوست ہے۔ یوں وہ بھی باپ کی غیر حاضری میں بنگلے میں وی۔ سی۔ آر۔ پر بلو پرنٹ دیکھتا رہا ہے جہاں اُن

---

(۱) گوٹھ: گوٹ۔گاؤں (۲) عمل: افیون (۳) زال: بیوی

کے دوست، ماسات (۱)، پھوپھاٹ (۲)، سوٹھ (۳)، بلکہ کچھ بڑی عمر کے بھائٹیے (۴) یعنی ماموؤں واسوؤں کے لڑکے اور بھائیوں کے بیٹے اور جو ذرا فری قسم کے نوکر ہیں سب ہی جمع ہوتے ہیں۔

لن یاسین خود اپنے باپ سے بیزار ہوگیا ہے اور جس دن اُس نے مجھے بتایا کہ اکثر اُس کے دماغ میں خیال آتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو شوٹ کردے اُس دن سے مجھے اُس سے خوف آنے لگا ہے۔

بات اصل میں یہ ہوئی تھی کہ منٹھار چوری سے باپ کی شراب بھی کباڈ cupboard میں سے نکال لیتا ہے اور وہیں کیسٹ بھی ہوتے ہیں اور ایک دن جب اُس نے کیسٹ چلائی تو سب کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں کیونکہ اُس میں تو وہی سجاول والی چھوکری اور منٹھار حاجی کے باپ کی بلو فلم بھری تھی — اور دونوں کو نشے میں بتایا تھا۔

جانی شاہ کا ایک گھر شہر میں ہے دوسرا گوٹھ میں۔

اُس کے شہر کے گھر میں دن بھر فلمیں چلتی رہتی ہیں، چاہے وہاں کوئی بیٹھا ہو یا نہ بیٹھا ہو اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی فلم کو آگے پیچھے کرنا جانتے ہیں۔ ملنے والے جو آتے ہیں سیّد سائیں کہہ کر جانی کے یا جانی کے باپ کے ہاتھ چومتے ہیں اور جو بات کرنے کو آئے ہوتے ہیں اُسے تو بھول جاتے ہیں البتہ فلم دیکھنے کو بیٹھ جاتے ہیں۔

خیر جانی کی ماں خوش ہے کہ جب سے گھر میں وی۔ سی۔ آر۔ اور کلر ٹیلی ویژن آیا ہے جانی کے باپ کا شہر آنا بڑھ گیا ہے — اور اب جب وہ شہر آتے ہیں تو دو ایک دن گھر پر بھی گذارتے

---

(۱) ماسات (۲) ققات (۳) سوٹ (۴) پائلٹو

ہیں وہاں پہلے یا تو آتے ہی جوا کھیلنے کو غائب ہو جاتے تھے یا گھر ہی میں فلاش چلتا تھا۔

جانی کا سب سے بڑا بھائی، جسے آگے چل کر زمینیں سنبھالنی ہیں اور آج کل وکیل بننے کا کورس کر رہا ہے، تین چار سال ہوئے باپ سے لڑ جھگڑ کر پیسے لے کر وی۔سی۔آر۔ اور کلر ٹیلی ویژن سیٹ لے آیا تھا تب سے پھٹی کے ہر سیزن (۱) میں وہ یا تو وی۔سی۔آر۔ سیٹ بدلتا ہے یا کار۔

جانی کے باپ نے پہلی دفعہ تو پیسہ بڑی مشکل سے دیا تھا پر اب اُنہیں بھی وی۔سی۔آر۔ کا نشہ چڑھ گیا ہے اور جوئے کا سوالی پن ختم ہو گیا ہے۔ البتہ جانی کی ماں سے اُن کی بات چیت بہت سال سے بند ہے۔ لیکن وہ اس پر بھی خوش ہے کہ باپ کے ہونے سے بچے کچھ تو رُوب (رعب) میں رہتے ہیں۔

جب وہ گھر میں ہوتے ہیں تو بھنڑچو، بھنڑچو کر کے نوکروں سے چائے کھانا باہر منگاتے رہتے ہیں اور بھنڑچو، بھنڑچو کر کے ہی روٹی، کھانے پر بھی اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ کس بھنڑچو نے پکائی ہے؟ — اور — یہ مانی (۲) ہے بھینڑچو!

جانی کی ماں کو شاید گوٹھ پسند نہیں، تب ہی تو شہر میں رہ رہی ہے۔ جانی اور اُس کے بھائی کہتے ہیں اُن کی تعلیم کی خاطر وہ شہر میں رہ رہی ہے۔

تو گلی گلی ہوتے ہوئے ہم شو دیکھنے جا رہے تھے۔ اور جب شام کی دوسری اذان ہو گئی، اور تھوڑا اندھیرا بھی، تو

---

(۱) کپاس تلنے بکنے کا زمانہ (۲) مانی: روٹی

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا 'اب مین روڈ پر چلتے ہیں'۔ اُس وقت تک ہم چھہ جنے ہو چکے تھے۔ سیّدوں کا لڑکا جالی، منٹھار حاجی کا بھائی یاسین، گل شکر بائی کا نزار، بیگو دین ارائیں کا لڑکا اختر، میں اور ظفر قائم خانی۔

ظفر نے پہلے تو ایسے ہی بہانا بنا دیا کہ وہ اپنے دادا کے لئے حکیم سے دوا لینے جا رہا تھا لیکن جب وہ ہمارے ساتھ چلتا ہی گیا تو اختر نے کہا

"سالے کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ اِدھر کون سا حکیم رہتا ہے اور تیرے دادا کا تو ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سچ بتا کدھر جا رہا ہے؟"۔ ظفر قائم خانی ہنسنے لگا اور بولا "ابے قسم لے لے، کدھر کو بھی نہیں۔ ایسے ہی تھوڑی دور ساتھ چل رہا ہوں"

جالی نے کہا "اس کی تلاشی لو"

ہم ظفر کو پکڑنے لگے لیکن یاسین نے کہا "اب چلنے دو۔ دیری ہو رہی ہے"۔

واقعی ہر طرف اندھیرا ہو چکا تھا، اور سڑک اُس جگہہ سے آگے بڑھ گئی تھی جہاں تک دوکانیں ہیں۔ پھر ہم کھیتوں کھیتوں ہوتے ہوئے اُس جگہ تک پہنچے جہاں منٹھار حاجی کے کالج کی باؤنڈری وال ٹوٹی ہوئی ہے اور ایک ایک کرکے اندر کود گئے۔

ہمارے پیچھے اور لڑکے بھی آ رہے تھے: اپنی پہچان والے بھی، پاڑے والے بھی اور اُن میں کچھ بڑی عمر والے بھی تھے۔ کچھ ایسا سین تھا جیسے گاؤں میں لوگ عید کی نماز رات کو پڑھنے

کو جا رہے ہوں، اور ہر طرف سے آ رہے ہوں۔
بڑی عمر والوں میں سے ایک کے بارے میں رفیق والگڑ نے مجھے بتایا اُس کے ماموں کے کالج کے سر ٹ، تھے جو کلاس میں وی۔ سی۔ آر۔ کو very charming rubbish کہتے ہیں اور جب پوچھو 'سر وہ کیا؟' تو کہتے ہیں

"کچرے کا ڈبہ گھر کے اندر"۔

سر ٹ کو لڑکے سر ربش (کوڑا کرکٹ صاحب) بھی کہنے لگے ہیں۔ سر ٹ کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اچھی بڑی عمر کا۔ اور دونوں کے آزو بازو کالج کی بڑی کلاسوں کے کچھ لڑکے بھی تھے۔

گھاس میں چلتے ہوئے دو ایک بار ہمارے پیر کیچڑ میں بھی پھنسے اور شروع رات کی ہلکی روشنی میں، میں نے دیکھا جہاں ہم چل رہے تھے کالج کی ہاکی گراؤنڈ تھی اور اُس کے ایک طرف کا گول اِس طرح ٹیڑھا ہو گیا تھا جس طرح بارش میں بھیگ جانے پر چارپائی ہو جاتی ہے — ایک پول آگے کو جھکا ہوا، ایک پیچھے کو اور اوپر کی راڈ اُن پر ترچھاٹ میں رکی وہ گئی تھی۔ میں نے ظفر سے پوچھا

"اِس میں گول ہونے کا فیصلہ ریفری کیسے کرتا ہوئیں گا؟"۔

یہ بات میں نے بے ساختہ کہی تھی، جیسے گھر میں پپا ہی سے بول رہا ہوں، پن اختر نے کہا

"سالہ گھیلوچھے۔ ابے یہ نہیں دیکھتا دوسری ٹیم پر تو گول ہوتا ہی نہیں ہوگا"۔

میں نے اُدھر اندھیرے میں نظر دوڑائی: واقعی اُدھر تو گول تھا ہی نہیں! صرف ایک طرف کا پول، اور وہ بھی آدھا، کھڑا

رہ گیا تھا۔

اُس وقت تک ہم کالج کی بلڈنگ کے مین گیٹ پر پہنچ چکے تھے لیکن وہ بند تھا اور دو لڑکے — جن میں سے ایک کلین شیو تھا اور دوسرے کی بہت بڑی مونچھیں تھیں، نیچے کو لٹکی ہوئی — آنے والوں کو بتا رہے تھے کہ دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے کو جاؤ، اُدھر کا راستہ کھلا ہے۔

میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور میں وہاں سے بھاگ جانا چاہ رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا ایسا کرنے پر اگلے دن بیگر دین ارائیں کا لڑکا اختر اور جوید اور رفیق والگڑ اور نزار اور جانی شاہ اور ظفر قائم خانی سب مجھے چھیڑینگے اور بورڈ پر وہ باتیں لکھینگے جو ہوتے ہکروں اور عورتوں کے سے کپڑے پہننے والے مردوں کے لئے کہی جاتی ہیں — وہ جو شادی بیاہ میں لوگوں کے گھر ناچنے گانے کو جاتے ہیں۔

ہم چھوٹے سے تنگ دروازے سے اندر کے کمرے میں داخل ہوئے جو دراصل کالج کی لائبریری تھی اور جہاں فرش پر موم بتیاں اُن اُن جگہوں پر جل رہی تھیں جہاں کسی کے ٹھوکر کھا کے گرنے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔

ہمارے اندر آنے پر دو لڑکوں نے جن کے گلے میں لاکٹ پڑے تھے ہم سے اور جو چھوٹی عمر کے لڑکے تھے یا شاید نئے آنے والے ہونگے سوال جواب شروع کر دئیے۔ ویسے کچھ پکڑ دھکڑ نہیں تھی۔ بس کچھ لڑکے تھے جو اپنی امپورٹنس (اہمیت) دکھا رہے تھے۔

اُنہی میں ہمیں غلام ثقلین اور راسجی مل بھی نظر آئے۔

غلام ثقلین کے گھر کے سامنے سے علم اٹھتا ہے اور راسجی مل

کو میں اِس وجہہ سے جانتا ہوں کہ اُس کی داڑھی ہے اور وہ کرمالی کا دوست ہے۔

ہمیں وہاں رکا دیکھ کر کسی نے آواز دی ”جانے دو“۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ وہاں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر پاؤں ٹیکے ایک داڑھی والا بڑی عمر کا لڑکا کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر بھی داڑھی تھی اور اُس کی زپ لگی ہوئی بنیان پر بڑے حروف میں کسی انگریزی سنگر کا نام لکھا تھا۔ اُس کے سگریٹ پینے کے انداز اور اُس کی داڑھی کو دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہوا۔

عجیب بات ہے پہلے لوگ، جن کے داڑھی نہیں ہوتی تھی اُنہیں برا سمجھتے تھے اور اب جب کلین شیو کا زمانہ ہے تو کوئی داڑھی رکھ لے تو اُسے بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے!

وہ لڑکا ایک الماری کے پاس کھڑا تھا جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور اندر کچھ اخباروں کی ردّی رکھی ہوئی تھی یا شاید دو ایک کتابیں ہونگی۔ موم بتی کی ہلکی روشنی میں، میں نے دیکھا الماری کا تالہ کھلا ہوا کنڈے سے لٹک رہا تھا اور خالی ہال میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اِسی طرح کی الماریاں کھڑی تھیں۔ جیسے عیسائیوں کے قبرستان میں لمبی لمبی قبریں کھڑی ہوں اور وہاں رات کا اندھیرا ہو۔ اُن میں سے کچھ کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی جگہہ ٹن کی چادریں جڑ دی گئی تھیں۔

ایک لڑکے نے پوچھا ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

میں نے کہا ”یہ کیا جگہ ہے؟“

اُس نے کہا ”لائبریری۔ ایک دن یہیں تمہیں آنا ہے؟“

پھر میں نے پوچھا ”شو کہاں ہے؟“

اُس نے کہا "اسمبلی ہال کی چھت پر"
میں نے کہا "اسمبلی ہال کہاں ہے؟"
"یہی ہے" اُس نے کہا۔ "میرا بڑا بھائی یہیں پڑھتا ہے، اِس لئے پورا کالج میرا دیکھا ہوا ہے"۔

میرے ساتھی اُس وقت تک دھکے کھا کھا کر اُس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں دو لڑکے کھڑے ہوئے داخلے کی فیس لے رہے تھے۔
جوید کا جب نمبر آیا تو اُس نے بڑے گھمنڈ سے پاکٹ بک نکال کر اُس میں سے سو کا نوٹ دیا اور اتنے ہی اطمینان سے گن کر باقی نو نوٹ جیب میں رکھے۔
کسی نے میرے کان میں کہا "اپنی بہن کو دیکھنے جا رہا ہے"۔
میں نے دل کڑا کر کے وہ نوٹ جو میری ہتھیلی کے پسینے سے گیلا ہو چکا تھا اُن لڑکوں کو دیا
اور اوپر چڑھنے لگا۔

پیچھے زپ لگی ہوئی بنیان پہنے ہوئے لڑکے کی آواز آئی "آدمی گنتے جا رہے ہو؟"

اختر نے ظفر قائم خانی کے سر پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا "کیوں بے تیرے دادا کی دوا پورے دس کی آتی ہے؟"
"اِس کے دادا کی نہیں، اِسکی" جانی نے کہا
"ویسے اِس کا دادا بھی اگر ــ" رفیق رانگڑ نے آواز نیچی کر کے کچھ کہا۔

ہمارے ساتھ ساتھ کچھ لڑکے بجلی کا سامان لے کر اوپر چڑھ

رہے تھے اور جب ہم اسمبلی ہال کی چھت پر پہنچے تو وہاں کچھ لڑکے کولھے جتنی اونچی منڈیر پر دو اینٹوں سے دبا کر ایک سفید چادر ٹانگ رہے تھے۔ کچھ لڑکے پروجیکٹر لگا رہے تھے اور کچھ جو ٹیلی ویژن اور وی۔ سی۔ آر۔ اوپر اٹھا کر لائے تھے اب اُن کے تاروں کو نیچے لٹکا کر شاید لائبریری کی کھڑکی میں کھڑے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اُنھیں نیچے کے مین سے لگا رہے تھے۔

چھت پر خوب چہل پہل تھی، جیسے میلہ ہو۔ لڑکوں نے جگہائیں لے لی تھیں اور چند مہمانوں کے لئے نجانے کہاں سے ایک صوفہ بھی آ گیا تھا جس کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی جگہہ اینٹیں رکھ دی گئی تھیں۔ صوفے کے پاس ہی چند کرسیاں بھی پڑی تھیں اور ایسا لگتا تھا سب کو معلوم ہے کہ وہاں انہیں بیٹھنے کا ہے۔ پھر اندھیرے میں اُس صوفے پر میں نے سر ٹ کو بیٹھتے دیکھاہ اور اُن کے ساتھی کو۔ رفیق رالنگو کے ساسوں نے ہمیں بتایا وہ صاحب پتہ نہیں کون ہیں پر اُنھیں سب سول اینڈ ملٹری کاک روچ یا سول اینڈ ملٹری لال بیگ کہتے ہیں۔ یوں سمجھو سر ٹ کو مکھن لگانے کے لئے لڑکے یہاں لائے تھے اور Mr. Civil and Military Cockroach کی مسکہ پالش سر ٹ کر رہے تھے۔

بس سب اُن دونوں کے آگے پیچھے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی تھے، کرسیوں پر بیٹھنے والے، لیکن صوفے کی خالی جگہہ پر کوئی اور نہیں بیٹھا۔

میں نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھا۔

ایک طرف کی منڈیر کے پاس ایک پیڑ کی کٹی ہوئی شاخ تھی جو سوکھ کر سفید رنگ کی ہو گئی تھی اور اُس کی چھال بھی غائب

ہو چکی تھی۔ دور کچھ کچے مکان نظر آ رہے تھے اور اُن کے آگے رنگین پانی کے جوہڑ تھے کیونکہ یہ علاقہ رنگریزوں کا تھا اور کبھی پہلے جب میں اس طرف آیا تھا تو میں نے گھروں سے بہہ کر آنے والے رنگین پانی کے اِن جوہڑوں کو دیکھا تھا۔ اُس رات اُس پانی میں سے ایک عجیب طرح کی بدبو اٹھ رہی تھی جیسے اُس میں کاسٹک بھی ملا ہوا ہو۔

آسمان اندھیرا تھا، بس کوئی کوئی تارا تھا۔

اندھیرے میں دو لڑکے زینہ چڑھ کر آئے اور ایک طرف کھڑے ہو کر ہماری تعداد گننے لگے۔ لیکن جس طرف سر ٹ اور مسٹر سول اینڈ ملٹری لال بیگ بیٹھے تھے اُس طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کی گنتی انھوں نے نہیں کی۔

پھر ایکدم بجلی آ گئی یعنی پروجیکٹر سے پردے پر لال رنگ میں لکھے ہوئے نمبر آنے لگے اور لڑکوں نے خوشی کا شور کیا۔ پروجیکٹر چلانے والا لڑکا تصویر کے چوکھٹے کو پردے کے بیچ میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر پیچھے سر ٹ اور مسٹر سول اینڈ ملٹری لال بیگ اور دوسرے مہمان بیٹھے تھے۔ میں نے سر ٹ کو کہتے سنا

”میں تو جی اِس چیز کو very charming rubbish کہتا ہوں۔ یعنی یوں سمجھئے کوئی سڑک کے کچرے کا ڈبہ اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ لے“

مسٹر سول اینڈ ملٹری لال بیگ نے انگریزی میں کہا ”میں نے تو اس چیز کو اپنے گھر ہی میں نہیں گھسنے دیا۔ ایک تو ننگا پن،

دوسرے بچوں کی تعلیم پر جو اِس کا اثر پڑتا ہے"

"بس جی" سر ث نے کہا "لڑکوں نے آج بڑا زور دیا کہ سر دیکھئے بڑی کلاسیکل فلم ہے، یہاں نہیں آئے گی۔ اِس لئے میں آ گیا"۔

اس کے بعد ایک لڑکے نے اعلان کیا "پہلے سینسر میٹریل censor material ہے، اُس کے بعد V.C.R. ہوگا"۔ پھر اُس نے پروجیکٹر والے سے کہا "سٹورو کرو"

سفید چادر پر ایک دم انگریزی کلر فلموں کے ٹکڑے چالو ہوگئے جن میں کوئی کہانی نہیں تھی اور ابھی بات آدھی ہی ہوتی تھی کہ سین بھی بدل جاتا تھا اور کام کرنے والے بھی۔

تصویریں چل رہی تھیں کیونکہ پروجیکٹر پر جو فلم کی ریل چڑھی ہوئی تھی وہی چل رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ مجھے اپنے پیچھے سے بھی اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

مجھے اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوا جیسے میں لال روشنی کے باڑے میں ہوں جہاں بدمعاش عورتیں بیٹھتی ہیں۔ میں نے گھبرا کر دوسری طرف دیکھنا چاہا لیکن اِس سے خوف اور بڑھ گیا اور میں نے سر جھکا کر سوچا علی کی تسبیح کاڑھوں۔ لیکن ایک ایک کرکے لڑکے کھڑے ہوتے جا رہے تھے کیونکہ پردے کو سنڈیر سے نیچے رکھنا تھا تاکہ دور سڑک پر سے نظر نہ آوے اور پیچھے بیٹھنے والوں کو تصویریں صحیح سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔

یہ سلسلہ شاید پینتالیس منٹ رہا ہوگا۔ پھر فلم کانپی اور بغیر 'دی اینڈ' آئے رک گئی۔

لڑکے فلم کے بارے میں بتانے لگے کون کون ایکٹر تھے، کون کون ایکٹریس اور کس فلم سے کون سا سین لیا گیا تھا۔

لیکن یہ تمام وہ سین تھے جو کبھی میں نے فلموں میں انہیں دیکھے تھے۔ پھر اِن لوگوں کے پاس کہاں سے آ گئے تھے؟ لیکن مجھے معلوم تھا میں ابھی نویں میں پڑھتا ہوں اور یہ شو کرنے والے کالج کے چھوکرے تھے اور انہیں زیادہ معلوم ہوگا۔

جس وقت بجلی کے تار بدلے جا رہے تھے تو چائے کی ٹرے لائی گئی اور جو اسپورٹینس والے لڑکے تھے اُنہوں نے اُسے سرت اور اُن کے سول ملٹری لال بیگ ساتھی کے آگے رکھا۔

دونوں پھر وہی باتیں کرنے لگے اور مسٹر سول اینڈ ملٹری کاک روچ نے کہا

"آپ انہیں کچرے کا ڈبہ کہتے ہیں، میں نے تو اپنے دونوں لڑکوں کو Swan Gully سوان گلی اسکول میں بورڈنگ میں رکھ رکھا ہے، پہاڑ پر — یہاں کے تو اسکول بھی کچرے کا ڈبہ ہیں۔

"Dustbin- Schools I call them.

بیگر دین ارائیں کے بڑے بھائی نے جو میرے برابر میں بیٹھا تھا، آہستہ سے میرے کان کے پاس منھ لا کر کہا

"دونوں اپنے دل کو جلاب دے رہے ہیں۔ جب نظر نہیں آ رہی تھی تو اٹھ کے کھڑے ہو گئے تھے!"۔

اُسی وقت وی۔ سی۔ آر۔ پر فلم شروع ہو گئی۔

مجھے اُس فلم کے رنگ اچھے لگے۔ اور کام کرنے والے بھی اچھے تھے: ایک گورا لڑکا اور ایک گوری لڑکی جو کسی پرانے ڈیزائن

کے پتھروں کے بنے ہوئے چرچ سے شادی کر کے نکل رہے ہیں، اور لڑکی کے پیچھے دو چھوٹی لڑکیاں ہیں اس کے شادی کے جوڑے کے پیچھے پھیلے ہوئے کپڑے کو سنبھالے ہوئے۔ اور ہر طرف پھول تھے اور بہت سے لوگ خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے اور پادری —

پھر میوزک چالو ہوا، اور کسی نے اچھی خاصی اونچی آواز میں کہا ''ڈکرا پیار علی اے سوں چھے؟ تو بھی اپنا کھوجہ بینڈ چالو کر''

پھر دوسرے نے کہا ''پیار علی ڈرم بجا، ابے نہیں تو یہ اب لڑکی کو لے کر کمرے میں بند ہونے والا ہے''

سب ہنسنے لگے

اور ایکدم وہ چرچ بھی غائب ہوگیا اور براتی بھی۔ اور پچھلی فلم کی طرح کے سین شروع ہوگئے اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف میرا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا

مجھے نہیں معلوم تھا میں گناہ کر رہا ہوں یا اوروں کے مقابلے میں بزدل ہو رہا تھا۔ پن خوف میرے اوپر چھایا ہوا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میں کیا کروں۔

جب وہ فلم ختم ہوئی تو مسٹر سول اینڈ ملٹری لال بیگ اور سرث اپنی جگہہ سے اٹھنے لگے اور غلام ثقلین اور رامجی مل اور بنیان والے لڑکے نے کہا

''سر بس دو منٹ اور۔ اب انڈین فلم شروع ہونے والی ہے۔ یہ تو بس ایسے ہی پاس ٹائم لگا دیا تھا''۔

پھر انھوں نے مہمانوں کو سگریٹ پیش کئے اور، اور چائے کے لئے پوچھا۔

تب ہی انڈین فلم شروع ہوگئی۔

مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ماں کتنی فکرمند بیٹھی ہوگی! پتہ نہیں پپا کو تو میرے کو ڈھونڈنے نہیں بھیجا ہوگا!

پھر ایک سین آیا جس میں ایک غنڈہ ہیروئن کو زمین پر گرا لیتا ہے اور سب کے کہنے سے وی۔ سی۔ آر۔ چلانے والے نے اُس سین کو تین بار دکھایا۔ کسی نے کہا 'اپنے تو پیسے وصول ہوگئے'۔

اسی طرح ایک گانا دوسری بار چلوایا گیا اور میرے ساتھیوں میں سے کسی نے کہا 'اِس کے بعد ایک بلو پرنٹ اور ہے'

تب ہی گولیاں چلنے کی آواز آئی اور کسی نے کہا ''چھاپہ!''

ایک لڑکے نے جیب سے پسٹل نکالتے ہوئے کہا ''ہو ہی نہیں سکتا'' اور منڈیر پر سے اُس طرف فائر کیا جدھر سے ہم پر، یا یہ کہ اِن لوگوں پر، فائر کیا گیا تھا۔

ایک گولی سے نیچے لائبریری کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

''چھاپہ پڑ گیا'' پھر کسی نے کہا۔

بڑے لڑکوں نے اور انھوں نے جو سر ث کے بازو میں بیٹھے تھے پوزیشنیں لے لیں اور کسی نے ایک کے بعد ایک، تین چار فائر کرنے کے بعد جواب دیا ''Out of question''۔

باہر سے لوگوں کے بھاگنے کی آواز آ رہی تھی

میرا منھ خشک تھا اور پیر کانپ رہے تھے۔

ایک لڑکے نے سفید سوکھے ہوئے بے چھال کے پیڑ کے سہارے نیچے اندھیرے میں اترنا چاہا لیکن شاید اُسے اندر سے دیمک کھا چکی تھی اور کالج والوں کو اِس بات کی خبر نہیں تھی جو اُسے

کھڑا رہنے دیا تھا۔ شاخ کے ٹوٹنے پر لڑکے کے نیچے گرنے کی آواز آئی۔

اِس کے ساتھ ہی ٹوٹی ہوئی شاخ کے کھکھ میں سے کچھ طوطے غصے میں چیختے ہوئے اندھیرے میں اُڑنے لگے۔

میں نے ہمت کر کے ایک لوہے کے پائپ کو پکڑ کر نیچے اترنا شروع کیا لیکن اُس کے زنگ کھائے ہوئے ٹکڑے اُکھڑ اُکھڑ کر میرے ہاتھ میں آ رہے تھے اور کچھ جو دھار دار تھے میری کھال کو کاٹ رہے تھے۔ پھر پائپ مع کلپ کے دیوار پر سے اُکھڑ گیا اور میں نیچے باڑھ پر گرا۔

لیکن ہاکی فیلڈ تک پہنچتے پہنچتے گولیاں رک چکی تھیں اور ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ کچھ دور تک مجھے کیچڑ میں چلنا پڑا لیکن مین روڈ پر پہنچ کر جب میں نے دور سے اسمبلی ہال کی چھت کو دیکھا تو لڑکے وہاں ابھی تک موجود تھے اور مجھے ہلکی سی روشنی بھی نظر آ رہی تھی — جو غالباً رنگین تھی اور ہل بھی رہی تھی۔

راستے بھر میں سوچتا آیا میرے لئے کیا بہتر رہے گا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں لال روشنی والے باڑے سے ہو کر نہیں آیا ہوں جس کا صرف ذکر میں نے اپنے بڑے ساتھیوں سے سنا تھا اور کئی بار خیال آیا بجائے گھر جانے کے راستے ہی میں کہیں اپنا خاتمہ کر دوں۔ یا دریا پر چلا جاؤں۔

لیکن جب میں گھر پہنچا تو ممی خاموش بیٹھی تھی اور

پپا بیٹھے گجراتی کا اخبار پڑھ رہے تھے جو میرے کو پڑھنی نہیں آتی ہے۔

ممی نے مجھ سے کہا ”پتہ نئیں میں آج دس روپے کا نوٹ کہاں گرا آئی۔ میری تو یادداست کھتم ہوتی جا رہی ہے۔ اکھا گھر ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئی۔ تیرے پپا صبح پانچ بجے نماج پڑھنے کو جماعت کھانے جب جاویں تو انھیں یاد دلا دیجیو کہ وہاں سیڑھیوں پر اور سب میں دیکھیں“۔

پھر اُس نے میرے کو کھانا دیتے ہوئے کہا

”بیٹا پیار علی تو گھر میں بیٹھ کے پڑھا کر۔ آج بھی کہیں پھائرنگ ہوئی ہے۔ میرے تو من کو سانتی نہیں رہتی ہے جب تو باہر ہوتا ہے“۔

جب میں سونے کو لیٹا تو آنسو بہہ کر میرے کانوں کو بھگو رہے تھے۔

سپنے میں، میں نے دیکھا کوئی میری طرف پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے آ رہا ہے اور میں اُس سے ڈر رہا ہوں۔ پن جب اُس نے ہاتھ باہر نکالے تو وہ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ پھر میری نظر اُس کی خالی جیبوں پر گئی جن پر خون کے دھبے ابھر آئے تھے۔

اگلی صبح جب میں اسکول پہنچا تو وہاں سب ہی موجود تھے — گل شکر بائی کا نزار، رفیق رالکوٹہ، جاوید، پیگر دہن ارائیں

کا لڑکا اختر، منٹھار حاجی کا بھائی یاسین اور جانی شاہ۔

سب نے مجھ سے کہا ”ابے کیوں بھاگ گیا تھا۔ ہم نے تو اُس کے بعد والی بی۔ پی۔ بھی دیکھی“۔

اس پر دو ایک لڑکوں نے جو بھاگ آئے تھے کہا ”اپنے تو پورے دس نہیں نکلے۔ پولیس چھاپہ نہیں مارتی تو ہم بھی پورا شو دیکھتے“

اس پر رفیق نے کہا ”یار وہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ پولیس کا چھاپہ واپہ نہیں تھا، کالج کے چھوکروں کا کچھ آپس کا پھڈا تھا“۔

مجھے بعد میں پتہ چلا کالج میں دو یونینیں ہیں — ایک اُن لڑکوں کی جنہیں یہاں کا سمجھا جاتا ہے، ایک اُن کی جنہیں یہاں کا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کو برا سمجھتے ہیں — لوفر، غنڈے۔ خیر اِس بات کا تو سب کو پتہ ہے۔ پھر اُن میں شو کرنے پر لڑائی ہوگئی کیونکہ اِس میں پیسے اچھے مل جاتے ہیں۔ آخیر میں اُن کے بڑوں نے فیصلہ کرایا: ایک ٹائم ایک یونین والے شو کرینگے اور اسمبلی کی چھت اُس رات اُن کی ہوگی، اور ایک ٹائم دوسری یونین والے۔

پن اُس رات غلطی اُس یونین کی تھی جس نے شو کیا تھا۔ یا شاید اُن چھوکروں کی ہووے گی جن کا دن نہیں تھا اور وہ باری والوں کو بھگا کر اپنا شو کرانا چاہتے تھے۔

لیکن میری سمجھ میں یہ باتیں ٹھیک سے نہیں آئیں کیونکہ ہمارے اسکول میں تو یونین ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی یونین کہاں سے آئیگی ہمارے اسکول کے ہال کا تو شاپنگ سینٹر بن گیا ہے

اور فنکشن ونکشن تو کیا اب تو گیم بھی نہیں ہوتے۔

خیر بات جو بھی ہو میرا ارادہ اب سمی کو دکھ دینے کا نہیں ہے اور نہ ہی میں اصل بات بتا کر اُس کا دل توڑنا چاہتا ہوں۔

جب بھی پیسے ملے میں اُسے اُسی کی پیٹی میں سے نکال کر دے دونگا اور کہونگا

"سمی یہ رہا تیرا اُس دن والا دس کا نوٹ!"۔

○

۱۹۸۲ء

■ تھوڑی دیر میں آکاش سرخ ہوکر بجھ گیا۔ سامنے کے مندر سے سندھیا کے لئے آنے والے اپنے گھروں کو چلے گئے اور پجاری مندر کے چبوترے پر آکر بیٹھ گیا۔ ہوائیں گھائل تھی۔ پجاری مندر کے دروازے پر سیاہ مورتی کی طرح بیٹھا تھا۔

■ ایڈورو کے جنگلوں میں ایک ہاتھی کا بچہ پکڑ کر سارجنٹ مذکور نے قانون شکنی کی ہے۔ جسکی سزا سیکشن ۵۳ کے تحت ہے اور وہ اس سزا کا مستوجب ہے۔

■ احمد سلاخیں پکڑے پکڑے زمین پر بیٹھ گیا۔ سپاہی نے ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے پوچھا۔ "احمد آخر سچی بات کیا ہے؟ تم نے اپنی بھابھی کو قتل کیوں کیا تھا؟" —— "اصلی بات بغیر کسی سے کہے ہی مرجاؤ گے؟"

■ جب وہ اوطاق میں آئی ہوئی ہوتی ہے تو گھر میں عورتیں اور لڑکیاں خاموش سی ہوجاتی ہیں اور یٰسین کی ماں نماز پڑھ کر وقت سے پہلے سونے کو چلی جاتی ہے۔ پر اس کی دادی اکیلی بیٹھی بیڑی پیتی رہتی ہے۔ پتہ نہیں کس وقت تک۔

■ میرا خیال تھا یہ پیشکش سن کر بوڑھے کا چہرہ جگمگا اٹھے گا اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ مشرق ہر نئی چیز کے مغرب میں دریافت یا ایجاد ہونے کا منتظر رہتا ہے۔

■ لوگ پانی میں کود رہے تھے۔ لیکن بجائے افسردہ اور پریشان دکھائی دینے کے ماسٹر (کپتان) ہنس رہا تھا۔ پھر وہ وہیں سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر تاشی کے بچتے لہروں پر بانٹنے لگا۔

■ وہاں آموں کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑی وہ منتظر تھی کہ ایشار الدین کچھ کہے۔ جو کچھ ہنگامہ بعد میں ہونا ہے اس کا بھید بھاؤ ابھی سے مل جائے۔